Regd. L. No.7243 Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1978

اس پرچہ میں

١- احتساب

٢- جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ [illegible] روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان — ۲۴/ روپے غیر ممالک — ۳ پونڈ	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	۲ دو روپے

جلد ۳۱	جولائی ۱۹۷۸ء	شمارہ ۷

فہرست

۱- لمعات ——— ۲
۲- اسلامی قوانین ——— ۵
۳- ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا ——— ۶
——— (پرویز) ———
۴- احتساب ——— ۹
۵- خلیفہ — ایک لغوی و اصطلاحی تجزیہ — ۲۵
——— (پروفیسر رفیع اللہ شہاب) ———
۶- اسلامی درسگاہ کی اصلاح و احیاء ——— ۳۱
——— (پروفیسر رفیع اللہ شہاب) ———
۷- باب المراسلات ——— ۳۴
——— (۱) مرکزِ ملت ———
۸- جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ- (قسط دوم) - (پرویز) ۳۷
——— (جمہوری اور اسلامی نظام میں فرق) ———
۹- حقائق و عبر ——— ۵۷
——— (۱) پاگل عورت سے نکاح ———
——— (۲) روحانی پرواز ———
——— (۳) مدیر الاعتصام کی خدمت میں ———
——— (۴) قسمت پر شاکر رہو ———
——— (۵) سیاسی پارٹیاں ———
——— (۶) اسلامی سزائیں ———
——— (۷) زکوٰۃ ——— (۸) ایک اور قوم ———
——— (۹) اسلامی نظام اور شیعہ حضرات ———

ایڈیٹر محمد خلیل- ناشر سراج الحق- مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور- پرنٹر شیخ نیاز احمد- علمی پرنٹنگ پریس ۷ ہسپتال روڈ لاہور میں چھپا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

یوں تو وہ کونسا دن ہے جب کرۂ ارض کے مختلف علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں پر کسی نہ کسی نئی آفت کا نزول نہیں ہوتا لیکن سابقہ چند ماہ سے برما میں بسنے والے بنگالی مسلمان جس عذاب میں مبتلا کئے جا رہے ہیں اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ اخبارات میں شائع ہونے والے اعداد و کوائف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کم و بیش پچاس لاکھ مسلمان آباد ہیں اور صدیوں سے آباد چلے آ رہے ہیں۔ صحیح صحیح اسباب اور وجوہات کا تو علم نہیں لیکن ان پر گوشۂ عافیت اس قدر تنگ کیا جا رہا ہے کہ وہ یا تو ملک چھوڑنے پر مجبور ہو رہے ہیں اور یا انہیں مار مار کر وہاں سے نکالا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک دو اڑھائی لاکھ کے قریب افراد، جن میں بوڑھے، بچے، عورتیں، مرد سب شامل ہیں۔ خانماں خراب، بے سر و سامان، بنگلہ دیش کی سرحد میں داخل ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ دس لاکھ کے قریب ابھی ان کے جنگلوں میں اپنی جانیں چھپائے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ نظر آتا ہے کہ یہ بھی بالآخر ادھر ہی کا رخ کریں گے۔ سرحد پار کر کے بنگلہ دیش میں آنے والے جن حالات میں عارضی کیمپوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے تصور سے انسان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ ادھر اُدھر کی تنظیمات کی طرف سے خیرات کے کچھ ٹکڑے ادھر پھینکے جا رہے ہیں لیکن ان کے سہارے جتنے دن اور جس قسم کے دن بسر کئے جا سکتے ہیں اس کے متعلق کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔

یہ تو وہ مصائب ہیں جو غیروں کی طرف سے وارد کئے جا رہے ہیں۔ ان سے صرف انسانیت کے نام پر اپیل کی جا سکتی ہے یا بین الاقوامی اداروں (مثل اقوام متحدہ وغیرہ) کے دروازوں پر دستک دی جا سکتی۔ لیکن یہ اقدامات طفل تسلیوں سے زیادہ نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔ انسانیت کے نام پر اپیل اس لئے لاحاصل ہے کہ اگر برما کے ارباب حل و عقد کے دلوں میں انسانیت کی ذرا سی بھی رمق ہوتی تو وہ اس قدر خلافِ انسانیت اقدامات کی جرأت ہی کیوں کرتے، باقی رہے تنظیمی ادارے تو مسلم ممالک کے معاملات کے حل کرنے میں وہ جس قدر دلچسپی رکھتے ہیں ہمارا سابقہ تجربہ اس کی کافی شہادت ہے ــــ کشمیر کا مسئلہ، فلسطینی خانماں خرابوں کا مسئلہ، افریقہ کی مختلف مسلم اقوام کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن سب سے زیادہ قابلِ غور وہ ردِّ عمل ہے جو بنگلہ دیش کی حکومت کی طرف سے ظہور میں آیا ہے۔ (ہم نے اسے صرف "قابلِ غور" کہا ہے ــــ جگر سوز، دل دوز، روح فرسا، تاسف انگیز نہیں کہا۔ کیونکہ ہم اس امید میں جذبات سے زیادہ واقعات سے متعلق بات کرنا چاہتے ہیں)۔ انہوں نے کہا ہے کہ برما کے یہ مسلمان باشندے، بنگلہ دیش کے نیشنل نہیں ہیں اس لئے ہم انہیں اپنے ہاں بسا نہیں سکتے۔ خالص آئینی اور قانونی نقطۂ نگاہ سے ان کا یہ اعتراض بالکل صحیح ہے۔ لیکن اس آئین اور قانون سے بلند و بالا ایک اور تصور بھی تو ہے جس کی طرف کسی کی نگاہ نہیں اٹھ رہی۔ (ضمناً بنگلہ دیش والوں نے وہاں کے "بہاری" باشندوں کو یہ کہہ کر تہ تیغ یا ملک بدر کیا تھا کہ وہ نسلی اعتبار سے بنگالی نہیں۔ اور اب برما کے بنگالیوں کو یہ کہہ کر اپنے ہاں آنے نہیں دیا جا رہا کہ وہ بنگلہ دیش کے نیشنل نہیں)۔ بہر حال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ برما سے نکالے ہوئے ان مظلوم انسانوں کو کسی دوسرے ملک میں اس لئے پناہ نہیں مل سکتی کہ وہ اس ملک کے نیشنل نہیں۔ نیشنلزم کا یہ وہ

نظریہ ہے جس نے اس کرۂ ارض کو مسلسل فتنہ و فساد کی آماجگاہ اور نوعِ انسانی کے لئے جہنم بنا رکھا ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے طلوعِ اسلام میں ایک بڑا عبرت انگیز واقعہ شائع ہوا تھا۔ افریقہ کے کسی ملک کی ستائی ہوئی ایک (غالباً ہندو) لڑکی وہاں سے بھاگ نکلی اور ساحل پر کھڑے ایک جہاز میں کہیں چھپ کر بیٹھ گئی۔ جہاز وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اب صورت یہ ہوئی کہ دنیا کے جس ملک کی بندرگاہ پر وہ جہاز لنگر انداز ہوتا اور وہ مظلوم لڑکی پناہ جوئی کی خاطر ساحل پر قدم رکھنا چاہتی ہے تو اس ملک کی حکومت اسے یہ کہہ کر جہاز میں دھکیل دیتی ہے کہ وہ ان کے ملک کی نیشنل نہیں ہے۔ جہاز دنیا بھر کا چکر کاٹ کر پھر اُسی ملک کے کنارے آلگا جہاں سے وہ لڑکی بھاگی تھی۔ اور جہاز والوں نے اسے پھر سے اسی ملک میں دھکیل دیا۔ اس ایک واقعہ سے اندازہ لگائیے کہ قومیت پرستی کے اس نظریہ نے انسان کو کس مقام تک پہنچا دیا ہے۔ اب مقہور اور مظلوم انسان کو اس آسمان کے نیچے کہیں بھی پناہ نہیں مل سکتی۔ بنگلہ دیش کی طرف سے جس آئینی ردِعمل کا اظہار ہوا ہے وہ اسی مملکت سے مختص نہیں، دنیا کی ہر مملکت کی طرف سے اسی قسم کے ردِعمل کا اظہار ہوگا جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی ملک کے ستائے ہوئے انسان کے لئے خدا کی زمین پر کہیں پناہ گاہ نہیں رہی۔

دنیا کی عام قوموں کی طرف سے بھی اس قسم کا ردِعمل کچھ کم تاسف انگیز نہیں لیکن جب یہ ردِعمل کسی ملک کی مسلمان آبادی کے سلسلہ میں کسی مسلمان مملکت کی طرف سے ہو تو یہ چیز یقیناً "قابلِ غور" ہو جاتی ہے۔ یہ مسلمان جس قرآن پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں، اُس قرآن نے بنصِ صریح تمام دنیا میں بسنے والے مسلمانوں کو ایک قوم ہی نہیں بلکہ انہیں ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے۔ ان کی اس عالمگیر قومیت پر نسل، رنگ، زبان، جغرافیائی حدود یا سیاسی مملکتوں کے امتیازات کسی طور پر بھی اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ تھا قومیت کا وہ تصور جو قرآن کریم نے عطا کیا تھا اور جس کی بنا پر کرۂ ارض پر بسنے والے تمام مسلمان ایک قوم کے افراد بن گئے تھے۔ ہم مسلمانوں نے اس قرآن پر زبانی ایمان کے دعوے کو تو برقرار رکھا لیکن اپنی عملی زندگی کی عمارتیں مغرب کے سیکولر تصورات کی بنیادوں پر استوار کیں۔ اب صفحۂ ارض پر پھیلے ہوئے ان مسلمانوں کے درمیان بھی قومیت کی وہی دیواریں حائل ہیں جو مغرب کے سیکولر تصورات کی پیدا کردہ ہیں۔ یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جس طرح (مثلاً) دنیا کے عیسائی باشندے وطنی قومیتوں کے دائروں میں محبوس، ایک دوسرے کے خلاف مصروفِ جنگ و پیکار رہتے ہیں۔ ان غیر مسلم مملکتوں اور مسلمانوں کی مملکتوں میں کوئی فرق نہیں۔ قرآنی نظریۂ قومیت کا تقاضہ یہ تھا کہ اگر افریقہ کے صحرا میں کسی حبشی کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو ایران اور توران کے محلات میں سونے والے سربراہوں کی آنکھوں میں وہ کھٹک پیدا ہو جائے جو انہیں اس وقت تک محرومِ خواب رکھے جب تک اس حبشی کے پاؤں سے کانٹے کی خلش دور نہ ہو۔ اسی بنا پر، اس قومیت کے معمارِ اوّل حضور نبی کریم نے اس قوم کو جسدِ واحد کی مثل قرار دیا تھا کہ جب اس کے کسی عضو میں تکلیف ہو تو سارا جسم وقفِ اضطراب ہو جائے۔ آج اسی قوم کے افراد کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی کے کان میں کسی مظلوم مسلمان کی چیخ کی آواز پہنچتی ہے تو وہ سب سے پہلے یہ پوچھتا ہے کہ اس مصیبت زدہ مسلمان کا تعلق کس قوم سے ہے۔ یوں تو اس باب میں دنیا کی تمام مسلم مملکتیں ایک ہی سطح پر ہیں لیکن ان میں مملکتِ پاکستان کی حالت سب سے زیادہ تاسف انگیز اور الم خیز ہے۔ اس مملکت کا وجود ہی دو قومی نظریہ کی بنا پر ظہور میں آیا تھا۔ دو قومی نظریہ کے معنی یہ کہ تمام مسلمان نظریۂ زندگی (ایمان) کی بنا پر ایک مستقل بالذات قوم ہیں اور اس کے مقابل تمام

غیر مسلم دوسری قوم کے افراد۔ لیکن اس نظریہ اور دعویٰ کی بنیاد پر حاصل کی گئی مملکت کی کیفیت یہ ہے کہ یہ صرف دوسری مسلمان مملکتوں کی طرح وطنی لحاظ سے ایک الگ قوم کی شکل اختیار کر چکی ہے بلکہ خود اس مملکت کے اندر مذہبی فرقوں، سیاسی پارٹیوں، صوبجاتی تفریقوں اور ذات برادری کے بندھنوں میں اس بری طرح جکڑی ہوئی ہے کہ یہ سیکولر معیار کے مطابق بھی ایک قوم نہیں بن سکی۔ سیکولر نظام میں بھی ابھی تک یہ کیفیت ہے کہ زائرے میں کوئی ایک سو سفید فام باشندوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے یورپ کی قریب قریب تمام سفید فام قوموں نے نہ صرف بیک زبان صدائے احتجاج بلند کی بلکہ اس کا بدلہ لینے کے لئے عملاً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مسلم ممالک میں اتنا سا بھی احساسِ یگانگت نظر نہیں آتا۔ مسلم ممالک تو ایک طرف، خود مملکتِ پاکستان میں بسنے والے مختلف فرقوں، سیاسی پارٹیوں، صوبجاتی گروہ بندیوں اور ذات و برادریوں کی قبائلی نسبتوں سے جو باہمی تفرقہ پیدا ہوا ہے اس نے اتنے سے مشترکہ احساس کو بھی باقی نہیں چھوڑا۔ ہماری مصیبت یہ ہے کہ غیر مسلم قومیں ہمیں مسلمان سمجھ کر ہمارے درپے آزار رہتی ہیں، اور ہم میں اسلام کی نسبت سے اتنا سا تعلق بھی موجود نہیں جتنا تعلق سیکولر اقوام کے افراد میں قومیت کی نسبت سے ہوتا ہے۔ پھر قیامت بالائے قیامت یہ کہ ہم میں سے ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ہم میں خالص اسلام کے رشتے سے باہمی کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت کو زبان پر لانے کی جرأت نہیں کرتا۔ یہ وہ عملی منافقت ہے جس نے ہمیں سیکولر اقوام سے بھی کہیں زیادہ تباہ و برباد اور ذلیل و خوار کر رکھا ہے۔ ہمارے لئے نجات کی ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ یا تو ہم کھلے بندوں اس کا اعتراف کریں کہ نہ صرف ہم میں بلکہ دنیا کے کسی مسلم مملکت میں بھی اس وقت اسلام موجود نہیں۔ اور یا ہم یہاں اسلام کو عملاً نافذ کر دیں۔ اس کے لئے آغازِ کار یہ ہوگا کہ پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمان ایک قوم (اُمّتِ مسلمہ) کے افراد ہوں گے جس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ یہاں نہ مذہبی فرقے باقی رہیں گے نہ سیاسی پارٹیاں نہ صوبجاتی تفریقات اور نہ رنگ و نسل اور ذات برادری کے امتیازات۔ سب مسلم ہوں گے اور صرف مسلم۔ یہ وہ تجدیدِ ایمان ہوگی جس کے متعلق قرآن کریم نے بہت پہلے کہہ دیا تھا۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ ..... (۴/۱۳۶) "اے وہ لوگو جو ایمان کے مدعی تو ہو لیکن درحقیقت مومن نہیں ہو، تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول کی طرف نازل کی تھی"۔ اس تجدیدِ ایمان کے معنے یہ ہیں کہ جو کچھ زبان سے کہتے ہو اپنا نظامِ زندگی اس کے مطابق متشکل کرو۔

باقی رہی دنیا بھر کے ستائے ہوئے انسانوں کے لئے کوئی پناہ گاہ، تو اس نے کہا تھا یہ پناہ گاہ وہ نظام ہے جس کی خصوصیت یہ ہے۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔ (۳/۹۶) جو بھی اس کے سایۂ عاطفت میں آگیا اسے دنیا کے ہر خوف و خطر سے امن نصیب ہو گیا۔ یہ نظام دنیا کے ہر مظلوم انسان کے لئے، مذہب، ملت، قوم، نسل، رنگ، زبان، سکونت کی تفریق و تمیز کے بغیر سپر کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا آخر الامر اس نظام کی طرف آئے گی۔ اسے اس کی طرف آنا پڑے گا کہ اس کے سوا انسانی مسائل کا کوئی اطمینان بخش حل نہیں۔

پاکستان میں اِسلامی قوانین

مدون کرنے کا سوال بڑی اہمیت اختیار کر رہا ہے۔ مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ ان کی بنیاد قرآن اور سنت پر ہونی چاہیئے۔ سنت کا مسئلہ اختلافی ہے اور آج تک حل نہیں ہو سکا۔ ہمارا مؤقف یہ ہے کہ قوانین اسی صورت میں مرتب ہو سکیں گے کہ قرآن مجید کو ان کی بنیاد قرار دیا جائے۔ اس بنا پر ہم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ قوم کو بتایا جائے کہ قرآنی قوانین کیا ہیں۔ اس فریضہ کو مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے بطریقِ احسن سرانجام دیدیا ہے اور ایک ضابطہ مرتب کر دیا ہے۔ جس کا نام ہے:۔

قرآنی قوانین

اس میں مختلف عنوانات کے تحت وہ تمام قوانین درج کر دئے ہیں جن کا تعلق اسلامی مملکت، حکومت اور نظام سے ہو سکتا ہے۔ ہر قانون سے متعلق آیت یا آیات اور ان کا ترجمہ یا مفہوم بھی دیا گیا ہے آپ سوچئے کہ اس سے اسلامی مملکت کا کتنا بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس کتاب کا:۔

۱۔ مسلمانوں کے ہر گھر میں ہونا ضروری ہے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ فلاں معاملہ میں قرآنِ کریم کا قانون کیا ہے۔
۲۔ اس کا ملک کے ہر جج اور مجسٹریٹ کی میز پر ہونا ضروری ہے۔
۳۔ ملک کے ہر وکیل (ایڈووکیٹ) کی لائبریری میں ہونا ضروری ہے۔
۴۔ لاء کالجز کے نصاب میں داخل کیا جانا ضروری ہے۔ اور
۵۔ ہر لائبریری میں اس کی موجودگی ضروری ہے۔

کتاب، اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ پر، اوفسٹ میں چھاپی گئی ہے اور مضبوط مُطلّا جلد میں محفوظ ہے۔

قیمت فی جلد بیس ۲۰/- روپے (علاوہ محصول ڈاک دو روپے)۔

۱۔ طلوعِ اسلام کی بزم میں اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں منگائیں اور اپنی فرمائشیں پندرہ جولائی تک بالضرور بھیج دیں
۲۔ جو پیشگی خریدار کتاب نہ منگانا چاہیں، اس کی اطلاع پندرہ جولائی تک، ادارہ کو بھیج دیں۔ اس تاریخ تک اطلاع موصول نہ ہونے کی صورت میں انہیں کتاب بھیج دی جائے گی۔

واضح رہے کہ ایک عرصہ پہلے "قرآنی قوانین واقدار" کے نام سے جو کتابچہ شائع کیا گیا تھا، یہ کتاب اس سے کہیں زیادہ مفصل ہے

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور — ملنے کا پتہ — مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

پرویز

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا!

مہ و سال کے شمار سے، ۹ جولائی ۱۹۷۸ء کو اپنی عمرِ رواں کے پچھتر (۷۵) سال پورے کر رہا ہوں۔ یہ کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں تھا جس کا خصوصیت کے ساتھ طلوعِ اسلام کے صفحات میں ذکر کیا جاتا۔ قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی موجودہ قرآنی فکر اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں پچاس سال پورے کر رہا ہوں۔ عام اصطلاح میں اسے گولڈن جوبلی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ پچاس سالہ "جوبلی" دنیا کی ہر متاع سے زیادہ گراں بہا اور اس کی یاد سب سے زیادہ وجہِ نشاطِ روح ہے۔ اور نشاط و انبساط کے یہی وہ احساسات ہیں جن میں اپنے بے شمار دیدہ اور نادیدہ احباء و رفقا اور متفقین کو شریک کرنے کے لئے میں نے اس کا تذکرہ ضروری سمجھا ہے۔ میں جب ساحلِ عمر کے ریگِ رواں پر ان پچاس سالہ نقوش کو مرتسم دیکھتا ہوں تو حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے مجھ پر ایک عجیب والہانہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مسرت اس احساس سے کہ میں نے زندگی کا جو مشن اپنے سامنے رکھا تھا اس میں مجھے اس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس سے میرا سرِ نیاز اس بارگاہ کے عتبۂ عالیہ پر بے ساختہ جھک جاتا ہے جس کی عطا کردہ راہ نمائی کے بغیر اس کامیابی کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور حیرت اس پر کہ تمام دنیاوی علائق کے باوجود (جن میں کم و بیش تیس سال ملازمت کے بھی شامل ہیں) میں نے انتہائی بے سر و سامانی کے عالم میں، تن تنہا یہ طول طویل مسافت طے کیسے کر لی؟ اس قسم کے علمی، تحقیقاتی، فکری پروگرام کی تکمیل کے لئے جو میرے پیشِ نظر تھا، کس قدر ساز و یراق اور کتنے معاونین اور رفقائے کار کی ضرورت ہوتی ہے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ جب لین (EDWARD WILLIAM LANE) نے عربی زبان کا لغت مرتب کرنے کا ارادہ کیا تو انگلستان کے ایک نواب (DUKE OF NORTHUMBER LAND) نے یہ پیش کش کر دی کہ اس اسکیم کے سارے اخراجات اس کی جاگیر سے پورے کئے جائیں گے۔ علاوہ ازیں خود حکومتِ برطانیہ نے بھی مستقل عطیات سے اس میں اضافہ کر دیا۔ مالی تفکرات سے اس طرح آزاد ہونے کے بعد وہ مصر چلا گیا جہاں اسے، حکومتِ مصر کے تعاون سے ہر قسم کی علمی سہولتیں حاصل تھیں۔ اس طرح اس نے دن رات کی محنتِ شاقہ کے بعد بیس سال میں اپنا لغت مرتب کیا ـــ (بدقسمتی سے وہ بھی حرف "ق" تک۔ بقیہ حروف کے وہ صرف نوٹ لکھ پایا تھا کہ اس کی وفات ہو گئی)۔ اس کی طباعت کیلئے اس نے اپنے بھتیجے (لین پول کو ـــ جو خود ایک ممتاز عالم تھا) متعین کیا۔ اس طرح اس لغت کی اشاعت ہوئی۔

میں نے قرآنِ کریم کا لغت ہی مرتب اور شائع نہیں کیا۔ اس کے علاوہ متعدد ضخیم تحقیقاتی تصانیف جن میں مفہوم القرآن۔ تبویب القرآن۔ مطالب الفرقان۔ معراجِ انسانیت۔ شاہکارِ رسالت جیسی ضخیم علمی اور فکری مطبوعات اور "انسان نے کیا سوچا؟" جیسی تحقیقاتی تصانیف بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ۱۹۳۸ء سے شائع ہونے والا ماہوار مجلہ طلوعِ اسلام۔ فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت سے متعلق عالمگیر تحریک۔ مسلسل درسِ قرآن کا سلسلہ۔ خطابات و تقاریر۔ وغیرہ ذالک۔ اور یہ سب نہ صرف انتہائی بے سر و سامانی کے عالم میں، کسی فکری رفیق کی معاونت کے بغیر بلکہ (جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے) دنیاوی علائق کے باوجود، جن میں قریب تیس سالہ ملازمت بھی شامل ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ میری صحت کبھی قابلِ رشک نہیں رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی دور کے چلّوں، مراقبوں، ریاضتوں نے مجھے طرح طرح کے عوارض کی آماجگاہ بنا دیا اور سانپ کی ان لکیروں نے عمر بھر میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ان ریاضتوں سے البتہ ایک فائدہ ضرور ہوا۔ اور وہ یہ کہ اپنے

مشن کی کامیابی کے لئے مجھے کامل انہماک اور ضبطِ خویش کی جس درویشانہ زندگی کی ضرورت تھی وہ مجھ پر کبھی گراں نہیں گذری، اور جن حالات سے بھی میں گذرا، مجھے اطمینانِ قلب حاصل رہا۔ حتیٰ کہ مخالفتوں کے ہجوم میں بھی میں کبھی پریشان خاطر نہیں ہوا۔ زندگی کی تعیش سامانیاں میرے لئے کبھی وجہ کشش نہیں ہوئیں۔ حالانکہ میں اگر چاہتا تو انہیں نہایت آسانی سے حاصل کر سکتا تھا۔ وذالك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

یہ کچھ میں نے کیسے کر لیا؟ سچ پوچھیے تو منطقی توجیہات سے اس کا کوئی اطمینان بخش جواب میں خود بھی نہیں دے سکتا۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بے صوت اَن دیکھی صدا مجھے بلاتی گئی اور میں "این وآں سے بیگانہ" والہانہ طور پر اس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس میں تھکنا تو ایک طرف میں کبھی سستانے کیلئے بھی نہیں رکا۔ بجز ان لمحات کے جن میں میں (علالت وغیرہ کی وجہ سے) بالکل معذور ہی نہ ہو گیا ہوں میں نے اپنے اوقات کا ایک ایک لمحہ اس کے لئے وقف رکھا۔ اس آواز میں کوئی ایسا سحر تھا کہ میں رک سکتا ہی نہیں تھا۔ یہ آواز خدا کی کتابِ عظیم، قرآنِ کریم کی تھی جس کے ساتھ میرا قلبی لگاؤ عشق کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اس میں کوئی عنصر فوق الفطرت نہیں تھا۔ نہ ہی مجھے اس کا کوئی دعویٰ ہے۔ میں نے اس تذکرہ کو اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ جو متجسس قلوب میرے اس حاصلِ کشت کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھیں ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اس میں کوئی بات غیر معمولی یا فوق البشر (SUPER-HUMAN) کا مظہر نہیں۔ انسان کے اندر اتنی بے پناہ صلاحیتیں مضمر ہیں جن کا اسے خود بھی علم و احساس نہیں ہوتا۔ اگر کسی مقصد کے ساتھ عشق کی حد تک لگاؤ پیدا ہو جائے تو یہ صلاحیتیں خود بخود کارفرما ہوتی چلی جاتی ہیں اور ان کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے۔ اس لئے جو کچھ میں نے کیا ہے، وہ (بلکہ اس سے بھی زیادہ) ہر شخص کر سکتا ہے بشرطیکہ اپنے مقصد کے ساتھ اسے عشق ہو۔

زندگی کے اس طویل سفر میں ایک عجیب تجربہ بھی ہوا۔ اور وہ یہ کہ عمر کے آخری حصہ میں انسان کی جسمانی قوتوں کا مضمحل ہو جانا قانونِ فطرت کا اقتضا ہے لیکن اگر انسان نے اپنی زندگی فکری تحقیق میں طالب العلمانہ انداز سے گذاری ہو تو ان قوتوں کے انحطاط کے علی الرغم، اس کی فکری صلاحیتوں میں عجیب ارتقا اور نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی فکری ارتقا اور جلا کا نتیجہ ہے جو میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر میری عمر اور صحت نے ایفا کیا اور فکری تخلیق کیلئے جو سہولتیں ضروری ہیں (اور جو اب تک مجھے کبھی میسر نہیں آئیں لیکن عمر کے اس حصے میں جو ناگزیر سی نظر آتی ہیں) وہ میسر آ گئیں تو جتنا کچھ میں اب تک پیش کر سکا ہوں، اس پر نمایاں اضافہ کر سکوں گا۔ وبیدہٖ التوفیق۔

جن احباب نے میری زندگی کے اس طویل سفر میں کسی حیثیت سے بھی میری معاونت یا رفاقت کی ہے اس موقع پر ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کا بصمیم قلب شکریہ ادا کروں، نیز اپنے اس ایمان کا اعادہ بھی کہ خدا کی یہ کتابِ عظیم (قرآن مجید) تمام نوعِ انسان کیلئے آخری، مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ضابطۂ ہدایت ہے۔ اور اس سے مستفید ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ کاروانِ انسانیت اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم مرخدا کے آخری نبی۔ محمد رسول اللہ کے نقوشِ قدم درخشندہ ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ جس نے اپنے حسنِ عمل سے بتا دیا کہ شرفِ انسانیت کی آخری منزل کونسی ہے اور ہدایتِ قرآنی کی روشنی میں اس تک کس طرح پہنچا جا سکتا ہے۔

اور آخر میں عرق آلود پیشانی، جھکی ہوئی نگاہوں، کانپتے ہوئے ہاتھوں۔ اور لرزتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ (اقبالؒ کی ہم نوائی میں) بحضور ربّ العزت یہ عرضداشت کر رہا ہوں کہ:

تو غنی از ہر دو عالم، من فقیر	روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر	از نگاہِ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

آستانۂ قرآنیہ کا فقیر بے نوا۔

(۲۰ر جون ۱۹۷۸ء)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلستان)
ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
149 SUTTON COURT ROAD
LONDON E13-9NR.
PHONE 01-552-1517.

لاہور میں ہر جمعہ ۸ بجے صبح (فون ۸۸۰۸۰۰)
۲۵/بی - گلبرگ ۲ - (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر چوہدری شاہنواز صاحب - عابد سلک انڈسٹریز (فون 30890)
(عقب اڈہ لاریاں - مائی دی جھگی)

کراچی میں ہر جمعہ کو ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام
کمرہ نمبر ۲۴ اردن چیمبرز - الطاف حسین روڈ
نیو چالی - کراچی ۲

ملتان میں ہر جمعہ صبح ۹ بجے (بذریعہ ٹیپ)
(فون 72071) دفتر شاہ سنز - بیرون پاک گیٹ

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار چار بجے شام
بمقام ۱۲/۱/بی - بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان
آغا محمد یونس صاحب رفیقی لین صدر - بالمقابل
دی آئی جی مین گیٹ پشاور سٹیڈیم باڑہ روڈ

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
(گجرات) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۶۶ لیاقت روڈ

لیہ میں ہر جمعہ کے دن بعد نماز مغرب کیپٹن غلام حیدر کے مکان نمبر ۲۵۱
(وارڈ ۱) واقع عقب گلی گرلز ہائی اسکول (بذریعہ ٹیپ)

کراچی کے خریدار متوجہ ہوں

یکم جولائی ۱۹۷۸ء سے کتب خانہ طلوعِ اسلام کراچی کے اوقاتِ کار حسبِ ذیل مقرر کئے گئے ہیں:-
ہر روز علاوہ جمعہ:- صبح ۱۰ بجے تا ایک بجے دوپہر
شام ۶ تا ۸ بجے شب
جمعہ:- صبح ۹ تا ۱۲ بجے دوپہر

محمد اسلام
کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام
کمرہ نمبر ۲۴ اردن چیمبرز - الطاف حسین روڈ - نیو چالی - کراچی ۲

کتب خانہ میں
ادارہ طلوعِ اسلام کی جملہ مطبوعات
دستیاب ہیں اور ایک پوسٹ کارڈ تحریر کر کے منگوائی بھی جا سکتی ہیں۔

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب

(اقبالؒ)

اِحتساب

(۱)

تحریکِ پاکستان کی تائید اور حمایت میں طلوعِ اسلام کی داستانِ جہاد، سینکڑوں نہیں، ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ہزاروں صفحات ہماری زندگی کی مقدس ترین آرزوؤں کے ترجمان تھے اور ان تحریروں کا ایک ایک لفظ خونِ جگر سے لکھا گیا۔ ہمیں فخر ہے کہ اس راہ میں ہم نہ تو کسی کی اندھی تقلید کے قائل تھے اور نہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی رضاجوئی ہمارا مقصود۔ ہم علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت پر یقین رکھتے تھے کہ جہاں تک احیائے دین کی مقدس آرزوؤں کا تعلق ہے وہ ایک جیتے جاگتے اور محسوس و مشہود نظامِ زندگی کے پیکروں میں ہی تکمیل پا سکتی ہیں اور ایک نظامِ حیاتِ معاشرہ یا مملکت کے قیام کے لئے ایک خطۂ زمین کا حصول ناگزیر ہے۔

بعض لوگ شاید اس خود فریبی میں مبتلا رہے ہوں (اور اب بھی ہوں) کہ اس خطۂ زمین کے حصول سے تحریکِ پاکستان کا مقصد پورا ہو گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک معاملہ اس سے کہیں آگے تھا اور یہ اگلی منزل (خطۂ زمین کے حصول سے بھی) کہیں زیادہ اہم تھی۔ ہمارے نزدیک اگر اس سرزمین پر نظامِ خداوندی کا آفتاب جلوہ بار نہیں ہوتا، اگر یہ مملکت اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا نہیں اٹھتی۔ اور اگر انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے بجائے یہاں خدائی قوانین کارفرمائی کا سرچشمہ قرار نہیں پاتے تو جس مقصد کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ تھی کہ حصولِ پاکستان کے بعد جب نئی منزل ہمارے سامنے آئی تو ہم نے اس منزل پر اربابِ اقتدار کے اٹھتے ہوئے ہر قدم کا بنظرِ غائر جائزہ لیا اور جہاں کہیں ہمیں یہ نظر آیا کہ تحریکِ پاکستان کے ارفع و اعلیٰ مقاصد کے دامنگیر ہونے کا خطرہ لاحق ہے۔ ہم نے پوری قوت سے اس کا محاسبہ کیا یہ محاسبہ اور مواخذہ اس قسم کی تخریبی اور انتقامی ذہنیت سے قطعاً پاک تھا جو تحریکِ پاکستان کے شکست خوردہ مخالفین، تحریکِ پاکستان کے کارفرماؤں کے خلاف، اپنی نفسیاتی کش مکش کی بنا پر بروئے کار لا رہے تھے۔ اس لئے

ہم نے جو کچھ کہا جذباتی روش سے بالاتر رہ کر کہا اور جن خرابیوں کی نشاندہی کی وہ علیٰ وجہ البصیرت کی۔ ہمیں بخوبی احساس تھا کہ جس فتحِ عظیم کی تاریخ میں ہمارا خونِ جگر شامل ہے اس کی عظمت کو قائم رکھنا کس قدر ضروری ہے اس لئے ہم جو کچھ ان کالموں میں برسرِ تحریر لاتے رہے اس کے ایک ایک لفظ میں ہمیں پوری پوری ذمہ داری ملحوظ رکھنی پڑی اور ہر ممکن حزم و احتیاط سے کام لیا گیا۔ بالخصوص یہ ذمہ داری کہ ہمارے قلم کی ہلکی سی جنبش بھی ایسی نہ ہو جس سے اس سرزمین کے استحکام پر خفیف سا بھی اثر پڑے۔

قوموں کی زندگی میں ایامِ رفتہ کا احتساب ایک خاص افادیت رکھتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

مملکتِ پاکستان کی زندگی کے گذشتہ سالوں میں طلوعِ اسلام نے اس نقطۂ نظر کے تحت اپنے کالموں میں جو کچھ لکھا ہے اس کا سلسلہ اس کی مسلسل اشاعتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ تحریکِ پاکستان کے کسی مخالف کی انتقامی اور انتشار پسندانہ تنقید نہیں، بلکہ اس تحریک کے مخلص ترین رفیقِ سفر کے فریضۂ رفاقت کی پکار ہے۔ یہاں ہم اس سلسلۂ تحریر کا جستہ جستہ ملخص اس مقصد کے تحت منظرِ اشاعت پر لا رہے ہیں۔ کہ واقعات کی رفتار میں گزرے ہوئے ایام کی کچھ یادیں از سرِ نو تازہ ہو جائیں۔ ہماری ملّی تاریخ اسی قسم کی یادداشتوں کا مرقع ہے۔ ان تنقیدوں اور تبصروں سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ ہم کن مراحل سے گذر کر یہاں تک پہنچے ہیں :؎

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

طلوعِ اسلام کے دورِ جدید کا آغاز (جنوری - فروری ۱۹۴۸ء کے مشترکہ شمارہ سے) آزادی اور استقلال کی فضا میں ہوا۔ پاکستان کی نوزائیدہ مملکت نے ابھی اپنی عمر کی پہلی ششماہی بمشکل پوری کی تھی۔ اپنی اس مختصر اور ننھی سی عمر میں ہی اسے پے در پے کس قدر زخم کھانے پڑے۔ اس کا سفینۂ حیات کیسی تند و تیز لہروں کی زد میں تھا اور اقتدار کے نئے نئے نشہ سے سرشار امراء و وزراء اپنی نازک ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو کر کن سرمستیوں میں کھوئے گئے تھے۔ یہ سارے مناظر اپنی دل دوز اور جگر سوز کیفیتوں میں طلوعِ اسلام کے سامنے تھے۔ اس کے صفحات لرزتے ہوئے دل کے ترجمان اور خون کے آنسوؤں سے تر بتر تھے۔ اپنے فریضۂ ملّی کے پیشِ نظر ہمیں تلخ نوائی سے بھی کام لینا پڑا ؎

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

چنانچہ دورِ جدید کے اس پہلے شمارے کا افتتاح اس عزمِ صمیم سے ہوا کہ ؎

وقت آں است کہ آئینِ دگر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

پھر اقبالؒ کے الفاظ میں دعا، اور حضورِ رسالت مآبؐ میں شوقِ نیاز کی وارفتگی شامل تھی۔ اس شمارہ کا انتساب "شہدائے کشمیر کے مقدس خون" سے تھا۔ اور ازاں بعد اپنی ملّی آزادی کے اہم گوشوں کی نقاب کشائی کے بعد طلوعِ اسلام نے زخم خوردہ ملت کے حضور میں اس کے زخموں کی داستان حسبِ ذیل الفاظ میں پیش کی۔

یہ ٹھیک ہے کہ :-

ہماری تباہی و بربادی، نکبت و زبوں حالی، ویرانی و خانماں خرابی، قتل و غارتگری اور دیگر ہجوم مصائب اور اندوہ تکالیف کی ذمہ داری ایک حد تک ہمارے ارباب حل و عقد کی ناعاقبت اندیشی اور غلط روی پر ہے۔

ہماری موجودہ کس مپرسی اور بے چارگی، مفلسی اور محتاجی، بے سروسامانی اور لاوارثی بڑی حد تک عمائدِ حکومت کی تغافل کیشی اور تساہل انگاری کی وجہ سے ہے۔

ہماری پریشانیاں اور رسوائیاں ایک گونہ ان کی بدنظمیوں اور بدعنوانیوں کا نتیجہ ہیں۔

ہمیں کھانے کے لئے روٹی، پہننے کے لئے کپڑا، رہنے کو مکان اور دیگر ضروریاتِ زندگی بآسانی میسر آسکتی تھیں۔ اگر افسرانِ متعلقہ میں بددیانت اور خائن، نالائق اور ناہنجار نہ ہوتے۔

ہماری مجبوریوں کا بہت سا بوجھ ہلکا ہو سکتا تھا اگر ان اربابِ نظم و نسق میں ایسے لوگ نہ ہوتے جو مزدوروں کے کفن تک آمار لینے میں کوئی باک نہ سمجھتے ہوں۔

ہماری بہت سی قیمتی جانیں جو حدودِ پاکستان میں پہنچنے کے بعد بھوک اور سردی کی نذر ہو گئیں، ضائع ہونے سے بچ سکتی تھیں اگر یہ جمود و تعطّل کی برف کی سلیں جو ہمارے سروں پر مسلط ہو چکی ہیں، جذباتِ مہر و محبت کی گرمی سے بروقت پگھل جاتیں۔ . . . . . .

یہ سب کچھ بجا اور درست ہے۔

اور پھر ـــــ اس کے بعد قوم کے سامنے اس کے نئے فریضۂ حیات کی تفصیل پیش کرتے ہوئے آخر میں بتایا کہ اسے بھول جاؤ کہ یہ اربابِ دولت و سطوت اس وقت کیا کر رہے ہیں صرف یہ یاد رکھو کہ پاکستان کے خطۂ زمین کے تحفظ کے لئے آپ نے کیا کرنا ہے۔

اگر آپ نے اِسے یاد رکھا تو

یہ سب طرّہ بازانِ دجل و فریب اس انقلاب کے سیلاب میں بہہ جائیں گے جو آپ کے ہاتھوں وجود میں آئے گا۔ اور اس وقت صرف وہی سرفرازی کی زندگی بسر کرے گا جو شرفِ انسانیت کے جوہر سے بہرہ یاب ہوگا۔

(طلوعِ اسلام۔ جنوری۔ فروری ۱۹۴۸ء۔ صفحہ ۱۴-۱۵)

ملّتِ پاکستان کو اس طرح اپنی اہم ذمہ داریوں سے خبردار کرنے کے بعد اس نے حکّامِ پاکستان کو یوں بیداری کا پیغام دیا۔

انگریز چلا گیا لیکن

اس کے نظامِ حکومت نے تمہارے قلب و دماغ کو جن سانچوں میں ڈھال دیا تھا تم نے انہیں بدستور قائم رکھا ہے بلکہ وہ برائیاں جو پہلے پھر بھی کسی حد تک، انگریز کے خوف یا شرم سے دبی دبی سی رہتی تھیں اُبھر اور نکھر کر اوپر آ گئیں۔ خارجی دنیا میں پوری کی پوری بساطِ سیاست و حکومت بدل گئی لیکن تمہارے قلب و نگاہ کی دنیا میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

دل نے دنیا نئی بسا ڈالی
تم کو لیکن ذرا خبر نہ ہوئی

وہی اپنوں سے بے گانگی و مغائرت، وہی مصنوعی رعب و داب، وہی خوشامد پرستانہ مسلک، وہی فریب کارانہ مشرب، وہی حیلہ جوئی اور کام چوری، وہی نالائقی اور نااہلی، وہی خیانت و بددیانتی، وہی اعزّہ پروری و جنبہ داری، وہی ظلم و استبداد، وہی جور و ستم، کوئی ماد خواہ نہیں جو تمہارے تغافل نا ہال نہ ہو۔ کوئی ستم رسیدہ نہیں جو تمہاری ناروائی سلوک کا شکوہ سنج نہیں۔ . . . .

یاد رکھو! اگر تم نے خود اپنے آپ کو نہ بدلا تو خدا کا نہ بدلنے والا قانون تمہیں بدل دیگا۔ اور اس کا بدلنا ایسا ہوتا ہے کہ اس میں تختہ الٹ جایا کرتا ہے۔	(ایضاً صفحہ ۱۲)

اس کے بعد اپنے دورِ جدید کی اسی اوّلیں اشاعت میں "طلوعِ اسلام" نے "پس چہ باید کرد!" کے عنوان سے زخم خوردہ افرادِ ملّت کے غیظ و غضب کو قدرے تند و تیز الفاظ میں پیش کیا تاکہ اپنے عشرت کدوں کی بدمستیوں میں کھوئے حکمران سن لیں کہ عوام کے غم و غصہ کی کیفیت کیا ہے۔ عوام کی اس چیخ و پکار کی ترجمانی اس نے بدیں الفاظ کی۔

کیا یہی ہیں وہ حکومتِ الٰہیہ کے ایوانِ خاص کے عمائدین و اراکین جن کی شیطنت پر انسانیت روتی اور آدمیت آنسو بہاتی ہے۔ جھوٹ، فریب، مکاری، دغابازی، رشوت ستانی، حرام خوری، خوشامد، تملّق، اعزّہ پروری، احباب نوازی، کیا یہی ہیں وہ خصوصیات جن کی خاطر غیروں کی حکومت پر اپنی حکومت کو ترجیح دی جاتی تھی؟ نااہلی، غلط اندیشی، تساہل انگاری، وعدہ خلافی، کام چوری، ملّت فروشی، خود غرضی، خود ستائی، ہوس پرستی، زر اندوزی۔ کیا یہی ہیں وہ معیار جن کی بنا پر اربابِ حکومت و سطوت کا انتخاب عمل میں لایا جاتا تھا؟ اسلام خطرے میں ہے، ملّت تباہ ہو رہی ہے۔ قوم ڈوب رہی ہے۔ کیا یہ سب نعرے اس لئے لگائے جا رہے تھے کہ ان اکابرین کے اپنے مفاد خطرے میں تھے؟	(ایضاً۔ صفحہ ۹)

اور عوام کی چیخ و پکار کا یہ تلخ و طویل سلسلہ پیش کرنے ہوئے اس نے لکھا کہ:۔

یہ ہیں وہ خیالات جو آجکل عام طور پر فضائے پاکستان کو عفریتی بگولوں کی رقص گاہ بنائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر یاس و قنوطیت کے آئینہ دار ہیں جو ناقابلِ برداشت آلام و مصائب سے پیدا ہو چکی ہیں۔ کچھ ان موہوم امیدوں کی شکست کی صدائیں ہیں جو لوگوں نے اپنے دلوں میں خود ہی پیدا کر لی ہیں۔ اور جن کے بروئے کار نہ آنے سے وہ جھنجھلا اٹھے ہیں۔ کچھ ایسے نشتروں کی حیثیت لئے رہتے ہیں۔ جنہیں طبیب مشفق، زہر آلود ناسور کی جراحت کے لئے بطور علاج تجویز کر رہا ہے..... ان خیالات کے محرک اسباب و عمل کچھ ہی کیوں نہ ہوں، یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اس وقت پوری کی پوری قوم کے دماغی توازن اور قلبی سکون کو کھو رکھا ہے۔ (ایضاً۔ ص۹۸)

یہ سب کچھ پیش کرنے ہوئے طلوعِ اسلام نے صورتِ حال کی اصلاح کے لئے جو نکات پیش کئے ان میں یہ بھی کہا گیا کہ:۔

جو نالائق اور بد دیانت گروہ حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مسانید اقتدار پر متمکن ہو چکا ہے اسے، اس کی صحیح قدر و قیمت کا آئینہ دکھا کر، اس کے اصلی مقام کی طرف لوٹا دینے کا انتظام کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی نوجوان طبقے کی تطہیرِ فکر اور تربیتِ قلب اس انداز سے کی جائے کہ وہ حکومت کے بارِ عظیم کو اٹھانے کے اہل ہو جائیں۔ (ایضاً۔ ص۹۹)

اس کے بعد طلوعِ اسلام کے دورِ جدید کا دوسرا شمارہ ملت کی دھڑکنوں کا ترجمان بن کر سامنے آیا۔ اس میں "باب الاسلام سندھ" کے عنوان سے، ان جگر پاش مناظر کو سامنے لایا گیا جو کسبِ معاش کی سرگردانی میں مبتلا مہاجرین کی گرفتاریوں کی صورت میں بپا تھے۔ اس نے جرأت مندانہ اخوت اور ہمدردی کے تقاضوں کو لبیک کہتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں لکھا۔

مہاجرین سے بے رحمی کیوں؟

حکومت نے ان غریب الدیاروں اور بے یاروں کو کوئی مراعات نہیں دیں۔ نہ انہیں دوکانوں کے لئے کوئی جگہ دی نہ رہنے کے لئے مکان اور نہ کاروبار شروع کرنے کے لئے ضروری سرمایہ بہم پہنچایا۔ لیکن جب ان لوگوں نے شبانہ روز محنت و جانفشانی سے رہگذر پر بیٹھ بیٹھ کر کسبِ معاش کی حقیر صورتیں پیدا کیں تو حکومت کا قانون فوراً حرکت میں آیا، اور ان پر ذریعۂ معاش بند کر دیا۔ چنانچہ ان بدنصیبوں کو پٹڑیوں پر سے اٹھا دیا گیا..... اب ہماری ہمہ گیر حکومت کی دسترس سے کچھ بھی محفوظ نہیں۔ موت کے منہ سے، جان جوکھوں میں ڈال کر، جان بچا کر پاکستان میں پناہ ڈھونڈنے والے نیم مردہ، پاکستان میں بھی موت ہی کے منہ میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ کیا اس سے یہ بہتر نہ تھا کہ وہ دشمنوں کی سفاکیوں کی نذر ہو جاتے؟ کم از کم وہ اس تلخی اور مایوسی کا شکار تو نہ ہوتے کہ جس پاکستان کی خاطر انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا

تھا، وہی ان کی رسوا کن موت کا باعث ہوا۔ جسے وہ جنت سمجھ رہے تھے وہ جہنم ثابت ہوا۔ وہ پھول چننے کے لئے بڑھے تو ان کی انگلیوں میں کانٹے پیوست ہو گئے۔ وہ اپنے بنائے ہوئے پاکستان کے قلب میں آئے تو انہیں ٹھکرا دیا گیا۔ وہ روٹی مانگتے تھے۔ انہوں نے خون پسینہ ایک کرکے روٹی کمائی اور حکومت پر بوجھ بننا گوارا نہ کیا۔ لیکن حکومت نے ان کی کمائی ہوئی روٹی ان سے چھین لی اور انہیں اور ان کے بھوکے بیوی بچوں کو بے رحم قانون کے پنجہ کے نیچے کچل دیا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۹)

دل کے زخمی تاروں کو یوں چھیڑتے ہوئے اس نے ایک تازیانۂ عبرت کے طور پر گہری اور حقیقت کشا طنز سے کام لیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک لرزہ انگیز وعید سب کے سامنے رکھ دی۔ اس نے لکھا:۔

یہ ٹھیک ہے کہ خوبصورت کراچی کی کشادہ سڑکوں کی دیدہ زیب پٹڑیوں پر یہ عرق ریز انسانی گروہ بھدے، بدصورت، مفلوک الحال انسان کلنک کا ٹیکہ تھے۔ وہ امراء و رؤساء شہر کے لئے بوجھ تھے۔ دختران تہذیب نو کے لئے ان کا نظارہ بھیانک تھا۔ وہ انسان نہیں تھے، بے جان پتھر تھے۔ ان پتھروں کا راستہ سے ہٹا دینا ہی بہتر تھا۔ اب کشادہ شاہراہیں، کشادہ رنگین پھریرے سیر و تفریح کے لئے کھلی ہیں۔ کل شوق اور پورے اطمینان سے ٹہلیئے اور بھول جائیے اس قیامت کو جس کے اثرات سے یہ پریشاں روزگار انبوہ در انبوہ مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ـــ یہ نفاست و نزاکت بجا اور درست!۔

لیکن قسم ہے اس خدائے قدّوس کی جس نے ربّ العالمین اور خیر الرّازقین کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا ہے کہ دنیا بھر کی نزاکتیں اور لطافتیں جہنم میں جھونک دینے کے قابل ہیں اگر وہ کسی ایک انسانی بچہ کے منہ سے روٹی کا ٹکڑا چھین کر وجود میں لائی گئی ہوں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۹)

اور پھر حسب ذیل الفاظ میں نشۂ اقتدار کے دیوانوں پر واضح کیا کہ:۔

حکومت محض قانون کا نام نہیں۔ اس کا کام قانون پاس کر دینا یا رائج کر دینا ہی نہیں۔ اس کے فرائض بھی ہیں۔ وہ قانون کی آڑ لے کر اپنے فرائض سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اس کا فرض تھا کہ وہ مہاجرین کے لئے کوئی جگہ مخصوص کرتی جہاں وہ کاروبار کر سکتے۔ ان کے لئے مناسب رہائش گاہیں مہیا کرتی تاکہ عام راہوں پر سونے کی بجائے وہ ان مقامات پر شب باشی کر سکتے اور شہر کی صحت کے لئے خطرے کا موجب نہ بنتے۔ لیکن حکومت نے اپنے ان فرائض سے مجرمانہ پہلوتہی کی اور جب مہاجرین از خود راہ راستے عمل تراشنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کے سعی و عمل کو قانون

کی ایک ہی حرکت سے اکارت کر دیا۔　　　(ایضاً۔ صـ۹۲)

اسی اشاعت میں "مجلسِ دستور ساز کے ارکان سے"۔۔۔۔۔ کے زیرِ عنوان طلوع اسلام نے پہلے کارفرمایانِ ملک پر حصولِ پاکستان کا مقصد واضح کیا اور اسلامی نظام کے نفاذ کی ناگزیریت واضح کرتے ہوئے ان کارفرماؤں کے اس طبقہ کی نشان دہی کی جو تمام مواعید کو پسِ پشت ڈال کر اسلامی دستور سے گریز کی راہیں اختیار کر رہا تھا اور سیکولرازم کی حمایت میں مکروہ سازشیں بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ ان ممتاز عناصر کے چہروں سے دلفریب نقاب اُلٹتے ہوئے اس نے لکھا:۔

اسلامی نظام سے روگردانی

اول الذکر گروہ ہے جو "ایماندار بے ایمانوں" پر مشتمل ہے۔ خطاب فضول ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نظریں جلوۂ گاہ دانشِ فرنگ نے خیرہ کر رکھی ہیں اور جن کی نگاہ میں کوئی ایسی چیز جچ نہیں سکتی جس پر لندن یا ماسکو کی مہر ثبت نہ ہو۔ ان کے نزدیک کوئی ایسا نظام قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ جو مغربی مادہ پرستی کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔

دوسرا گروہ وہ ہے جسے ہم "بے ایمان ایماندار" کہہ سکتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ یہ گروہ یا تو بزدل ہے کہ اپنے دلی معتقدات کے اظہار سے ڈرتا ہے، یا فریب کار کہ اپنے موجودہ دنیاوی مراتب کو برقرار رکھنے کے لئے وہ بات کہتا ہے جس میں اسے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی امید ہو سکتی ہے ۔۔۔۔۔۔ اس بنا پر ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام و قرآن سے ان لوگوں کی والہانہ شیفتگی ایک فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ انہوں نے عوام کی نازک رگ کو پہچان لیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عوام کے ذہن اس چیز کو سننے اور برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جو ان کے قلوب کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے ۔۔۔۔۔۔ ان لوگوں سے ہم گزارش کریں گے کہ وہ قوم سے مذاق کرنا چھوڑ دیں۔ ان کی قیادت کے ایوان ریت کے ستونوں پر استوار نہیں رہ سکتے۔ اس لئے جس قدر جلد وہ اس فریب کاری، ملمع سازی اور منافقت کو ترک کر دیں بہتر ہے۔　　　(ایضاً۔ صـ۱۱)

واضح رہے کہ یہ دور ایک نوزائیدہ مملکت میں تعمیر کا آغاز تھا۔ اس مرحلہ پر اگر ایک اینٹ بھی غلط رکھی جاتی تو ایوانِ مملکت کی دیواریں ٹیڑھی ہو کر رہ جاتیں۔ چنانچہ طلوع اسلام نے وقت کے اہم ترین تقاضوں کی بجا آوری میں پوری ذمہ داری سے مثبت اور تعمیری تنقید کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اربابِ اقتدار، نشہ حکومت میں عوام سے دور چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اگلی اشاعت میں اس نے پوری قوت سے اربابِ بست و کشاد کو اس روش کے انجام سے آگاہ کیا۔ اس کے مقالہ کا عنوان تھا:۔

طرزِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اور اس عنوان کے تحت اس نے لکھا:۔

۔۔۔۔۔۔ کیا جن عوام کے خون اور پسینے پر آپ کے قصرِ حکومت کی بنیادیں قائم تھیں

ان کا اتنا بھی حق نہیں کہ آپ انہیں بتائیں کہ آپ کی ضروریات کیا ہیں؟ کیوں ہیں؟ عوام آپ کے لئے کیوں مزید قربانیاں دیں؟ کیا قربانی کے یہ بکرے اتنا حق بھی نہیں رکھتے کہ انہیں معلوم ہو کہ ان کے خون کی ضرورت کیوں پڑ گئی ہے؟

ضمیرِ کائنات میں پہلو بدلنے والی تبدیلیاں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اب وہ وقت نہیں رہا کہ قوم کو گونگا اور خاموش مجمع سمجھ لیا جائے۔ یا انہیں اس وادیٔ سکوت ــــ اور جمود ــــ میں رکھا جائے۔ (شمارہ اپریل ۱۹۴۸ء۔ صـ۹۳)

ان نئے تقاضوں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس نئے کارفرمایانِ مملکت کو احساس دلایا کہ:۔

ہم اربابِ حکومت پر اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جہاں تک ہم نبضِ ملت کا احساس کر رہے ہیں انہیں ملت کا اعتماد حاصل نہیں۔ یہ عدمِ اعتماد اگر کسی صحیح ترقی یافتہ جمہوری ملک میں پایا جاتا تو حکومت کب کی شکست کھا چکی ہوتی ..... یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس وقت ملت حکومت کو "اپنی" نہیں سمجھتی۔ وہ اسے بدستور اجنبی اور غیر سمجھ رہی ہے۔ حکومت نے یہ غلط فہمی رفع کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اربابِ حکومت مشینوں کی طرح پہلے سے طے شدہ آئین و ضوابط کے مطابق حکومت کر رہے ہیں اور بس۔ وہ خود اس احساس و شعور سے، تہی معلوم ہوتے ہیں کہ اب حکومت "اپنی" ہے۔ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی "اور" کا ملازم تصور کرتے ہیں۔

اے کاش اس "اور" سے مراد ملت ہوتی!

ایضاً۔ صـ۹۵

انہی ایام میں "یومِ عالمِ اسلام" کی تقریب پر کراچی میں تقریر کرتے ہوئے ملک فیروز خاں نون نے کہا کہ مسلمانانِ پاکستان کو اسلام کا مفہوم ترکی اور ایران جیسے "ترقی یافتہ" ممالک سے سمجھنا چاہیئے۔ ملک صاحب کی تقریر کے اقتباسات پیش کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے "اسلامی حکومتیں" کے عنوان سے اس مضحکہ خیزی کا یوں پوسٹ مارٹم کیا۔

اسلامی حکومت کی انوکھی مثال

..... اس وقت ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اسلامی حکومتوں کی بہترین مثال ترکی اور ایران ہے۔ ترکی کانوں پر ہاتھ رکھ رہا ہے کہ ہماری حکومت اسلامی نہیں۔ غیر دینی (SECULAR) ہے۔ اور ایران پر وہ ملوکیت مسلط ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ ہیں ہمارے اکابر جن سے مسلمان توقع وابستہ کئے بیٹھے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ کریں گے جو مسلمانوں کو اسلام فہمی کے لئے ترکی اور ایران کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کریں۔ ان کی اسلام فہمی کو ہزار سلام۔ اس سہاگ سے تو رنڈاپہ اچھا۔ (طلوعِ اسلام، جون ۱۹۴۸ء۔ صـ۲۰)

پاکستانی سکوں کے ڈیزائن اور نقوش کی اصلاحوں میں ہندوستانی سکوں کی جس کورانہ تقلید سے کام لیا گیا اس پر اسلامی تقاضوں کی روشنی میں طلوعِ اسلام نے کڑی تنقید کی اور اس کے آخر میں لکھا:۔

اندھی تقلید

ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکومتِ پاکستان کے کارندے ـــــ الا ماشاء اللہ ـــــ ندرتِ فکر و عمل سے معرّا معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا اندازِ کار دفتری ہے اور دفتر کا مثالی نمونہ ان کے نزدیک ہندوستان ہے۔ پاکستان کے دفتری نظام کو یہ دیمک چاٹ رہی ہے۔ یہ اکاس بیل دن بدن پھیل رہی ہے اور نظام پژمردہ ہو رہا ہے۔ پاکستان کو ان پامال راہوں اور فرسودہ روایات کو لامحالہ ترک کرنا پڑے گا۔

(ایضاً صـ۲۱)

اخبار ڈان میں یہ خبر شائع ہوئی کہ پاکستان کے وزیرِ مالیات ملک غلام محمد (مرحوم) ایک شام کلفٹن کے ساحل پر پتنگ بازی کا شغل فرما رہے تھے۔ اتنے میں ان کے ایک اور وزیر بھائی وہاں پہنچے۔ اور وہ بھی اس رنگین مشغلہ میں ان کے شریک ہو گئے۔ پاکستان کی زندگی میں بڑے نازک مسائل کا ہجوم اور اس کے وزرائے کرام کی یہ مشغلہ بازیاں۔ طلوعِ اسلام نے "پاکستانی وزراء کے مشاغل" کے عنوان سے اس سلسلے میں گہری طنز کا جو اشارہ انگیز پہلو اختیار کیا وہ ملاحظہ ہو۔

اقبالؒ کو ساحل کی بزم آرائی سے اصولی اختلاف تھا کہ ـــــ آنجا

نواسنجِ زندگانی نرم خیز است

اقبالؒ نے محض اظہارِ اختلاف پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ مشورہ دیا کہ ؎

بدر یا غلط و با موجش در آویز

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

ہمارے وزراء اقبالؒ سے اس حد تک تو ضرور اتفاق کر سکے کہ ساحل تک محدود نہیں رہنا چاہیئے۔ وہ آگے بڑھے لیکن پا در آب نہیں بلکہ پا در ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ زمین کے ہنگاموں سے فارغ ہو چکے ہوں اور سعدی کے الفاظ میں آسمان پروازی شروع کر دی ہو۔ یا ہوا کو آب پر ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وزارت ـــــ بلکہ خود پاکستان ـــــ باد آورد ہے ـــــ یعنی آندھی کے بیر ـــــ لیکن یہ مشق بہرحال اچھی تھی کہ پاکستان میں ہنوز ہوائی قلعے تعمیر ہو رہے ہیں۔

(ایضاً۔ صـ۲۲)

۱۶ اپریل ۱۹۴۸ء کو پناہ گزینوں کی امداد کے نام پر مستورات لاہور کی "پناہ گزینوں کی امدادی کمیٹی" نے لارنس باغ میں ایک مینا بازار کا "جشن رچایا"۔ اس جشن کی رنگینیوں کی جو رپورٹ "ڈان" میں شائع ہوئی وہ غیرتِ ملی کو ایک کھلا چیلنج تھی۔ اس سے متاثر ہو کر طلوعِ اسلام نے بعنوان "قوم کے غم میں" اپنے ایک شذرہ میں تحریر کیا:۔

..... یہ ان پناہ گزینوں کی امداد ہو رہی ہے، جن میں ہماری لاکھوں مائیں اور بہنیں ایسی ہیں

ہمدردی یا عیش سامانیاں

جنہیں ستر ڈھانپنے کے لئے چیتھڑا تک میسر نہیں جن کے شیر خوار بچے ایک گھونٹ دودھ کی خاطر بلک بلک کر جان دے رہے ہیں۔ جن کے معصوم کم سن ایک کمبل کے نہ ہونے سے سردی سے اکڑ کر مر رہے ہیں۔ جنہیں آسمان کی نیلی رواق کے سوا کوئی چھت نصیب نہیں۔ یہ ان کی امداد کے لئے لارنس باغ کی مست فضاؤں میں مسرتوں کے جھولے جھلائے اور خوشیوں کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ مظلوموں اور بے کسوں کی بپتا مٹانے کے لئے کیسے حسین انداز ہیں۔ دن بھر طرب و نشاط کی محفلیں گرم کیں۔ شام کو دو دو چار چار پیسے اکٹھے کر کے ریلیف فنڈ میں بھیج دیئے۔ اخبارات میں ان بیش بہا قربانیوں کا چرچا ہوا۔ ریڈیو نے اس ایثار کے ڈھول پیٹے۔ بیگم صاحبہ کی "ملی خدمات" پر میاں صاحب نے مونچھوں پر تاؤ دیا اور انہیں آئندہ الیکشن میں لیگ کا ٹکٹ حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ نہ ہوئے آج لسان العصر (حضرت اکبر الہ آبادی) ورنہ معلوم ان کی صدائے دردناک آج کیا کچھ کہتی۔

یہ ریلیف فنڈ بھی ہمارے لئے عجیب تماشے کا موجب بن رہے ہیں۔ کسی ڈرامیٹک کمپنی کا "نئے سین سینریوں" سے کھیل ہو یا کسی سینما کا نگار و قریب افتتاح۔ کسی مغنی آتش نفس کی محفل رقص و سرود ہو یا کسی بھانڈ کا تماشا، ایک مختصر کا اعلان ریلیف فنڈ کے لئے کر دیجئے۔ پھر دیکھئے۔ ان میں شرکت کس طرح نہ صرف ملی خدمت میں ہی شمار ہوتی ہے بلکہ کار خیر ہونے کی وجہ سے ثواب کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔ کس قدر بدبخت ہیں وہ جو اب بھی محروم رہ جائیں !!

آؤ۔ آگے بڑھو۔ قوم پر ایسی افتاد روز روز نہیں پڑا کرتی۔
پس از مدت گذر افتاد ایں جا کاروانے را

(ایضاً۔ صفحہ ۲۷-۲۶)

اسی اشاعت میں "لیڈرانیاں" کے عنوان سے ایک شذرہ کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

ملت کی لیڈرانیاں

.... اس سے بھی زیادہ حیرت کا مقام اس سے ذرا آگے بڑھ کر آتا ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ کرسیٔ حکومت پر بیٹھنے والا ہی اپنے آپ کو ملت کا بہترین دماغ سمجھنے لگ جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ان کی بیگم صاحبہ بھی فوراً لیڈرانی بن جاتی ہیں۔ میاں، لڑکوں کے کالج کا افتتاح کرنے جا رہے ہیں تو بیوی صاحبہ نرسنگ ہوم کے تقسیم انعامات کے جلسہ کی صدارت فرما رہی ہیں۔ وہ یوم استقلال کے جشن مسرت میں "سنت شبیری" کی تلقین فرما رہے ہیں اور یہ پردہ باغ کی نمائش میں "اسوۂ فاطمہ" کی تقلید کی تاکید کر رہی ہیں۔ حالانکہ نہ انہیں معلوم ہے کہ سنت شبیری کے غایات کیا ہیں اور نہ انہیں پتہ کہ اسوۂ فاطمی کے مقتضیات کیا۔ لیکن بایں ہمہ وہ مردوں کے واحد قائد ہیں اور یہ عورتوں کی امام۔ اور کوئی پوچھنے والا نہیں کہ یہ قیادت و امامت کن خصوصیات کی بنا پر آپ کے حصہ میں آئی ہے۔ خدا حافظ ہے اس قوم کا جس کی قیادت اس طرح سے بٹ رہی ہو۔ جو لوگ اپنی ذاتی جائیداد تک کا انتظام نہیں کر سکتے انہیں امور سلطنت کا نظم و نسق سونپ دیا جاتا ہے۔ اور جو بیگمات اپنے گھر بھی درست

نہیں رکھ سکتیں وہ تعمیر امومت کا فریضہ سنبھال لیتی ہیں ——— اگر انہی کی زندگیاں قدم کے لئے باعثِ تقلید ہیں تو

خدا ایں سخت جاں را یار بادا!

(ایضاً۔ صفحہ ۳۰-۳۱)

اپریل ۱۹۴۸ء میں حکومت نے اپنی سرپرستی میں ایک ادبی ماہنامہ "ماہِ نو" کا اجرا کیا۔ اس مجلہ پر کس طرح پانی کی طرح روپیہ بہانا مقصود تھا اور اس کے صفحات کس طرح ادبی عیاشیوں کا سرچشمہ بن رہے تھے یہ سب کچھ ایک طرف اور لاکھوں مہاجرین کی معاشی بے بسی اور خود حکومت کی مالی بے چارگی دوسری طرف نظامِ ربوبیت کا علمبردار قومی زندگی کے اس نازک مرحلے پر یہ رنگ رلیاں کیونکر گوارا کر سکتا تھا۔ اس نے "طاؤس و رباب اوّل" کے عنوان سے اسی اشاعت کے ایک زوردار مقالہ میں کڑی تنقید کرتے ہوئے لکھا:۔

ادبی عیّاشیاں

ہم حکومت سے پوچھتے ہیں کہ ایک ادبی رسالہ کے اجرا سے اس نے بالآخر کونسا تعمیری کام کیا ہے؟ کیا اچھے افسانے، معیاری اشعار اور لطیف ادب حکومت کی اجارہ داری (MANOPLY) ہیں؟ ..... کیا ڈرامے، افسانے، گیت اور غزلیں قوم کی ان مشکلات کا حل پیدا کر دیں گے جن کا رونا ہر وقت رویا جاتا ہے۔ خدا کے لئے کوئی بتائے تو سہی کہ بالآخر وہ کونسی ضرورت تھی جسے پورا کرنے کے لئے یہ ادبی رسالہ جاری کیا گیا ہے؟ حکومت کی یہ غلط بخشی ہمارے نزدیک ان قرونِ ماضیہ کی مسرفانہ یاد ہے جب دربارِ شاہی میں خوشامدانہ قصائد کے ایک ایک شعر پر شاہی خزانوں کے منہ کھول دیئے جاتے تھے اور شاعر کا منہ موتیوں سے بھر دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ اس زمانہ کی بات ہے جب کسی کو بھوک نہیں ستایا کرتی تھی۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ پاکستان میں ہمہ گیر خلفشار ہے ....

اس مقالہ کے آخر میں طلوعِ اسلام نے حکومت کو بدیں الفاظ اپنا مخلصانہ مشورہ پیش کیا۔

ہم حکومت سے پھر گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو جمہور کی آواز بنائے۔ ملت کو یقین دلائے کہ حکومت ملت کی ہے۔ اور خود اس کا ثبوت دے کہ وہ ملت کو اپنی ملت سمجھتی ہے موجودہ طریقے عوام سے رابطہ پیدا کرنے کے نہیں .... اب حقائق سے کھیلنے یا چشم پوشی کا وقت نہیں۔ پاکستان ایک حقیقت ہے وہ نہ افسانہ ہے نہ شعر ——— زندگی بجائے خود افسانہ ہے، نہ شعر۔ ہم میدانِ جنگ میں ہیں۔ زندگی سعیٔ پیہم ہے اور جہادِ مسلسل۔ شاعری، زندگی کے حقائق سے گریز کا نام ہے۔

(ایضاً۔ صفحہ ۳۵-۳۶)

"ماہِ نو" منظرِ اشاعت پر آیا ہی تھا کہ مغربی پنجاب کے "نیرونما" کارفرماؤں نے بھی قدم آگے بڑھایا، اور عوام کے قومی خزانے سے ایک رقمِ خطیر ہفتہ وار "استقلال" کے اجراء کے لئے وقف کر دی — قومی صورتِ حال کی اس قیامت میں جو چاروں طرف برپا تھی حکومت کے یہ اللّے تللّے "طلوع اسلام" کے لئے کیونکر قابلِ برداشت قرار پاتے۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں "مصرعِ ثانی" کے عنوان سے اس نے لکھا۔

مرکز کی دیکھا دیکھی اب مغربی پنجاب بھی ایک جریدہ لے کر بیٹھ گیا۔ یہ اقدامات افسوسناک ہی نہیں، شرمناک بھی ہیں۔ کیا مرکزی اور صوبائی حکومتیں یہ سمجھتی ہیں کہ وہ سرکاری خزانوں کی بلاشرکت غیرے مالک ہیں؟ کیا ان خزانوں پر ان کا تصرف انہیں یہ حق بخشتا ہے کہ وہ شخصی اور استبدادی قوتوں کی طرح رعایا کا خون چوستی رہیں اور اس خون سے اس قسم کی ذہنی تفریحات کا سامان بہم پہنچائیں؟ جمہوری حکومت کے مدعی اور نمائندے ہونے کی حیثیت سے وہ قوم کے سامنے جواب دہ ہیں۔ قوم کا حق ہے کہ وہ اس اسراف کا جواز معلوم کرے اور عدمِ جواز کی صورت میں بازپرس کرے۔ یہ صحیح ہے کہ قوم میں وہ قوتِ محاسبہ مفقود ہے جس نے حضرت عمرؓ ایسے صاحبِ قوت و عظمت کا دامن کھینچ لیا تھا اور ان سے برسرِعام جواب طلب کر لیا تھا ...... ہم دورِ عمرؓ سے زمان و مکان کے لحاظ سے ہزار فرسنگ دور ہیں۔ لیکن یہ دور آکر رہے گا۔ حکومت کو جاننا چاہیئے کہ روزنوں کے لئے چٹائیاں اور لوٹے مہیا کرنے سے اسلامی نظام رائج نہیں ہو جاتا اور نہ "محکمہ احیائے ملّتِ اسلامیہ" کے قیام سے مطلوبہ فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ نظامِ اسلامی ایک ہمہ گیر فضا کا نام ہے اور اس میں محکومیت صرف اللہ کی ہوتی ہے۔ انسان انسان پر حکمران نہیں رہتا۔

(طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۴۸ء۔ صنا۳)

اس تنقید کے آخر میں اس نے اربابِ حکومت کو ان کی "قومی منزل" کے متعلق خبردار کرتے ہوئے لکھا:۔

اس نئی منزل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ پاکستان کا استحکام بغرضِ قیامِ حکومتِ خداوندی ہو۔ اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے جس قدر روپیہ بھی صرف کیا جائے بجا اور برمحل ہوگا۔ اس کے لئے قوم کے دل و دماغ کی تعمیر صحیح خطوط پر ہوگی۔ اور ادبِ صالحہ کے ذخائر سے قوم کا سینہ مالامال ہو جائے گا۔

لیکن یہ تو وہ کرے جس کی نگاہوں کے سامنے کوئی منزل اور سینہ میں اس منزل کے حصول کی تڑپ ہو۔ یہ ان کے بس کی بات نہیں جن کی ساری زندگی "طاؤس و رباب" کی چلتی پھرتی تصویر ہو۔

(طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۴۸ء۔ صـ۳۲)

یومِ حساب

۵ر جولائی ۱۹۴۸ء کو ملک غلام محمد (مرحوم) نے (بحیثیت وزیر مالیات پاکستان) لنڈن میں ایک اخباری بیان کے ذریعے لارڈ مؤنٹ بیٹن کی ظالمانہ سازشوں کو پہلی بار بے نقاب کیا اور ثابت کیا کہ تقسیمِ ہند کے موقع پر لاکھوں مسلمانوں کا قتلِ عام اسی ظالم کی منشاء سے بروئے کار آیا تھا۔ اسلامیانِ پاکستان میں ان انکشافات کا تاثر عام طور پر یہی تھا کہ مؤنٹ بیٹن کے خلاف ان کی منافرت مزید شدت اختیار کر گئی۔ لیکن "طلوعِ اسلام" کے سامنے اس تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ خود ہماری قوم کے ان غم گساروں نے قوم کو ان حالات سے بے خبر کیوں رکھا؟

"قوم پوچھتی ہے" کے عنوان سے اس نے ملک موصوف اور مرکز کے دیگر کارفرماؤں سے باز پرس کرتے ہوئے لکھا:-

قوم اپنے لیڈروں سے پوچھتی ہے کہ جب آپ کو اتنے وثوق سے اس کا علم ہو چکا تھا کہ اتنا عظیم خطرہ مسلمانوں کے سر پہ منڈلا رہا ہے اور آپ کو اس کا بھی علم تھا کہ مؤنٹ بیٹن مسلمانوں کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں کریں گے، بلکہ شاید وہ اس سازش میں خود شریک ہے، تو آپ نے اپنی قوم کو اس قتل و غارت گری سے بچانے کے لئے کیا انتظامات کئے؟ کیا ان حالات میں، آپ کا فریضہ محض اس قدر تھا کہ آپ لارڈ مؤنٹ بیٹن سے تحفظِ امن کا مطالبہ کرتے؟ ..... آپ مؤنٹ بیٹن کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے تھے تو کیا آپ سوئے قوم آ کر قوم کو آنے والے خطرات سے آگاہ نہیں کر سکتے تھے؟ اسے اس کے لئے تیار نہیں کر سکتے تھے؟ یا اسے حالات سے آگاہ کر کے یہ موقع نہیں دے سکتے تھے کہ وہ از خود اپنی حفاظت کے سامان کرے؟ جب تک قوم کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا وہ اس نتیجہ تک پہنچنے میں بالکل حق بجانب ہے کہ مسلمانوں کے تمام قتل و غارت کا ذمہ دار، قومی نقطۂ نگاہ سے، نہ مؤنٹ بیٹن ہے، نہ مرکزی حکومت ——— بلکہ اس بے گناہ دریائے خون کی ساری ذمہ داری، ان رہنمایانِ قوم کے سر ہے جنہوں نے خطرے کو بھانپا لیکن قوم کو بے خبر رکھا۔ جنہوں نے سیلابِ بلا اُمڈتے دیکھا لیکن قوم کو آگاہ کرنے کے روادار نہ ہوئے

.....

..... آپ نے تو مؤنٹ بیٹن کا دامن حریفانہ کھینچا ہے اور اسے مورد الزام قرار دیا ہے، اور قوم آپ کا دامن کھینچتی ہے۔ اور لاکھوں مظلومین کے بے گناہ خون کی دہائی دیتی ہے اور یہ پوچھتی ہے کہ "بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ" ذبح ہونے والی مائیں، بے آبرو ہونے والی بہنیں، نیزوں کی انیوں سے چھدنے اور پتھروں پر پاش پاش ہو جانے والے بچے، کرپانوں سے شہید ہونے والے نہالانِ ملت جو موت کی مہیب اور پُرسکوت وادی میں جھونک دیئے گئے ہیں، ان کی معصومیت و مظلومیت کیا پکار پیدا کرنے اور نہ تھمنے والی چیخ

کی صورت میں ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ تاریخ کا مکبر الصوت اس چیخ کو "صورِ قیامت" میں بدل دے گا اور یہ مردے "زندہ ہو کر پوچھیں گے ؎

قصاصِ خونِ تمنا کا مانگیے کس سے
گنہگار ہے کون اور خون بہا کیا ہے؟

قوم حق بجانب ہے کہ لیڈروں کے اعتراف کے پیشِ نظر ان سے کہے کہ ؎

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

(طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۴۸ء۔ صفحہ ۷۴-۷۸)

شانِ بے نیازی

آگے بڑھیئے! اگلی اشاعت (ماہ نومبر) میں "پاکستانی افسر" کے عنوان سے اربابِ اقتدار کی شانِ بے نیازی کی تصویر حسبِ ذیل الفاظ میں سامنے آتی ہے :۔

اربابِ اقتدار کی "دورِ باشی" نے ابھی تک عوام کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ملک کی عنانِ اقتدار فی الواقع انہوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے ..... قیامت یہ ہے کہ خود حکومت کی مشینری کے مختلف پرزوں میں ربطِ باہمی مفقود ہے۔ ماتحت و افسر کا امتیاز پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ محترم وزیرِ اعظم کے بکرار اعلانات کے باوجود ان افسران کی شانِ حاکمیت میں کوئی فرق نہیں۔ ان کی سیرت میں بدلے ہوئے حالات نے کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ (طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۴۸ء۔ صفحہ ۲۹)

قومی بارگاہ میں جواب دیجئے

دسمبر کے شمارہ میں مجلس دستور ساز کے ارکان کا محاسبہ کرتے ہوئے ہائیں الفاظ خطاب کیا گیا۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے بنیادی سوال، تدوینِ آئین کا تھا۔ تاکہ یہ سرزمین بے آئین نہ رہنے پائے۔

یہ تھا وہ اہم فریضہ جو آپ حضرات کے سپرد کیا گیا۔

کیا قوم آپ سے باادب پوچھ سکتی ہے کہ آپ نے اس فریضہ کی انجام دہی میں اس وقت تک کیا کیا؟ اور اگر کچھ نہیں کیا تو آپ کے پاس کوئی معقول وجہ بھی ہے؟

معاف فرمایئے! اگر آپ میں تدوینِ آئین کی اہلیت نہیں تو کھلے بندوں اس کا اعتراف کیجئے، اور یہ فریضہ دوسروں کے سپرد کیجئے جو اس کی اہلیت رکھتے ہوں۔

اگر آپ میں اہلیت ہے لیکن، محض اپنے تساہل یا تغافل کی وجہ سے، آپ اس فریضہ کو سرانجام نہیں دے رہے، تو یہ تغافلِ مجرمانہ ہے۔ اس کی جواب دہی کے لئے کسی عدالت کے کٹہرے میں آجایئے۔

(طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۴۸ء۔ صفحہ ۱۲)

صدرِ دستوریہ کی بوالعجبیاں

۱۷ دسمبر ۱۹۴۸ء کو مجلسِ دستور ساز پاکستان کے صدر نے ایوانِ دستوریہ میں جو تقریر کی اس میں انہوں نے اسلامی دستور کی تشکیل کے قومی مطالبہ کے متعلق بڑا "ندامت آمیز" سا انداز اختیار کیا اور دستوریہ کے ہندو ارکان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ کہا کہ اس قومی تقاضے کو پورا کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ آئین وسیع المشرب (COSMOPOLITAN) ہونا چاہیئے۔ مملکت کے اس منصبِ عظیم سے اس قسم کا اعلان، ایسی مرعوبیت کا مظہر تھا جس کی روادار غیرتِ اسلامی قطعاً نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ طلوعِ اسلام نے اپنے "لمعات" میں اس پر سخت تنقید کی اور اسلامی نظام کی ضرورت و اہمیت کو ناگزیر قرار دیتے ہوئے لکھا:-

ہم حیران ہیں کہ بالآخر اس قسم کی ذہنیت کو کیا کہا جائے؛ ہمیں حیرت ہے کہ ہمارے محترم اربابِ بست و کشاد کو ہو کیا گیا ہے؛ کیا اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا ان کے ایمان کا تقاضا نہیں؛ کیا ان کا مسلمان کہلانا اس دعوے کی دلیل نہیں کہ ان کا ضابطۂ حیات وہی ہونا چاہیئے جس کی طرف نسبت رکھنے سے یہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں؛ .....

..... محترم صاحبِ صدر کے یہ الفاظ فی الحقیقت ایک تاسف انگیز نفسیاتی کیفیت کا مظاہرہ ہیں۔ مسلمان کچھ اس طرح انگریز (اور اس کے بعد ہندو) سے مرعوب رہا ہے کہ اسے اپنے دعویٰ اسلام کو بے دھڑک پیش کرنے میں ایک جھجک سی محسوس ہوتی ہے۔

..... کیفیت یہ ہے کہ اپنی آزاد سلطنت ہے۔ اس سلطنت کا آزاد دارالخلافہ ہے۔ اس دارالخلافہ میں آزاد مجلسِ آئین ساز ہے۔ اس مجلسِ آئین ساز کا آزاد صدر ہے لیکن جذبۂ مرعوبیت اس قدر غیر شعوری طور پر اعصاب پر مستولی ہے کہ یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اور صاحبِ صدر ہندو ارکانِ اسمبلی سے جھجکتے، سہمے، لرزتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم کیا کریں۔ قوم ہمیں مجبور کر رہی ہے اس لئے ہمیں اس کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے ورنہ ہم اس قسم کی "فرقہ وارانہ تنگ نظری" کی ذہنیت نہیں رکھتے کہ پاکستان کے لئے مذہبی نظامِ حکومت کا خیال تک بھی دل میں لائیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہم اس باب میں کس قدر مجبور ہیں۔

اور اس موضوع کا اختتام ان الفاظ پر ہوا۔

کیا اچھا ہوتا اگر وہ (صدرِ دستوریہ) اس باب میں خاموشی سے کام لیتے اور اس طرح جاننے والوں کی نگاہوں میں اپنا بھرم بنا رہنے دیتے اور نہ جاننے والوں کی نظروں میں اسلام کی رسوائی کا موجب نہ بنتے۔ لیکن اس واقعہ کا دکھ اتنا ہی نہیں اصل دکھ یہ ہے کہ یہ صاحب اس مجلس کے صدر ہیں جس سے ہماری یہ توقعات وابستہ ہیں کہ وہ ہمارے لئے اسلامی آئین مرتب کرے گی۔

مری اس سادگی پر رحم کھانا
کہ تم سے آرزوئے دل بیاں کی

(طلوع اسلام بابت جنوری ۱۹۴۹ء۔ صفحہ ۱۰۹)

یہ مُردنی کیوں؟

اسی شمارہ میں، پاکستان کی پہلی سالگرہ پر (جو ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء میں منائی گئی تھی) عوام کے جذبات و حسیات کی ترجمانی کرتے ہوئے طلوع اسلام نے لکھا:-

قائدین ملت اور ارباب حکومت نے، عمومی طور پر مابعد تقسیم جس عدم تدبر، اور اکثر مواقع پر بے حسی کا ثبوت دیا، اس سے ہر شخص نالاں تھا۔ آزادی پاکستان کے ساتھ ہی جس لاقانونیت نے سر اٹھایا تھا وہ اس حد تک بڑھی کہ خود ان لوگوں کے دلوں سے بھی قانون کا احترام اٹھ گیا جن پر قانون کو منوانے کی اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ رشوت ستانی، ناجائز خویش نوازی، ادائیگی فرض میں کوتاہی، یہ وہ جراثیم تھے جو انصرام ملکی کے بیشتر شعبوں میں داخل ہو چکے تھے۔ غیر مسلم بنیوں کی جگہ لینے والے مسلمان بنیوں نے (اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہ) چور بازاری، ناجائز نفع بازی، اور ذخیرہ اندوزی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ضروریات زندگی کی غیر معمولی گرانی اور نایابی نے "قدیم پاکستانیوں" میں بھی ہیجان پیدا کر رکھا تھا۔ الغرض ہر شخص غیر مطمئن اور شاکی تھا۔ بے اطمینانی اور بے چینی کی اس فضا میں جشن پاکستان منایا گیا۔ ایسے مواقع پر پیشتر ازیں جو قدرتی اور بے ساختہ جوش و خروش ہوا کرتا تھا وہ اب کے نمایاں طور پر مفقود تھا۔ "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگانے والے پھیپھڑے ضرور موجود تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ نعرے اعماق قلب سے نہیں اٹھ رہے۔ ان نعروں میں پہلی سی بے ساختگی نہ تھی۔ لہٰذا ان سے رگوں میں وہ پہلی سی حرارت بھی پیدا نہ ہوتی تھی۔ (طلوع اسلام۔ جنوری ۱۹۴۹ء۔ صفحہ ۵۰-۵۱)

اس بڑھتے ہوئے قومی جمود کی وجہ کیا تھی؟ طلوع اسلام نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:-

اس "بے دلی" کی ــ دوسری اور اہم وجہ یہ تھی کہ جشن پاکستان کی تقاریب سو فی صد سرکاری تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ عوام و حکام میں اب کوئی فرق نہیں رہا کیونکہ دونوں ملت پاکستان کے اجزائے لاینفک ہیں لیکن عوام کی یہ ذہنی خلش قابل فہم تھی کہ وہی حکام جو قیام پاکستان تک اس قدر رسوا ہو چکے تھے، اور جن کا نامۂ اعمال قیام پاکستان کے بعد بھی بہت زیادہ قابل تعریف نہیں رہا، اب پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اور ملت کے وہ غیر سرکاری مخلص خدام جو کل تک جنگ پاکستان کے کماندار تھے اب پولیس کی لاٹھی کے پیچھے دبکے کھڑے ہیں۔

(طلوع اسلام۔ جنوری ۱۹۴۹ء۔ صفحہ ۵۱)

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

"خلیفہ" — ایک لغوی اور اصطلاحی تجزیہ

اسلامی نظامِ حکومت میں سب سے بڑے حکمران (سربراہِ مملکت) کے لئے خلیفہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے لفظ خلافت بنا ہے جو اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد ہے۔ لہٰذا اسلامی لٹریچر میں اس لفظ کی اہمیت کے بارے میں کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے۔ لیکن اس اہمیت کے باوجود اس لفظ کے لغوی معنی کو طرفِ مناسب دھیان نہیں دیا جاتا، جس کی وجہ سے اکثر غلط نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ پھر یہ بے دھیانی عام لوگوں تک محدود نہیں۔ بلکہ اچھے بھلے اہلِ علم بھی محض اس کے سنے سنائے مفہوم پر اپنے استدلات کی عمارتیں تعمیر کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے بعض بڑے اہم موضوعات میں پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ یہ لفظ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کے معانی نہایت واضح الفاظ میں نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس کے باوجود اکثر ذہن اس بارے میں صاف نہیں ہیں۔ بنا بریں مناسب معلوم ہوا کہ عربی لغت اور قرآنِ مجید سے اس کے صحیح مفہوم کی وضاحت کر دی جائے۔

خلیفہ کی لغوی تشریح سے پہلے اس بنیاد کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جس کی وجہ سے ہمارے ہاں اس مفہوم کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ غلط فہمی یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ حالانکہ نہ تو اس کا ذکر قرآنِ مجید میں کہیں ہے اور نہ ہی رسول اللہ صلعم کا اس بارے میں کوئی ارشاد ملتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی ایک تشریح ملتی ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایک عام انسان تو ایک طرف خود مسلمانوں کا سب سے بڑا فرمانروا بھی خدا کا خلیفہ نہیں۔ جب حضور صلعم کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ حضرت صدیقِ اکبرؓ سے خلافت کی بیعت کر چکے تو اس کے بعد ایک شخص نے آپ کو "خلیفۃ اللہ" یعنی اللہ کا خلیفہ کہہ کر پکارا۔ آپ نے اسے فوراً ٹوکا اور فرمایا کہ میں "خلیفۃ الرسول ہوں۔ خلیفۃ اللہ نہیں ہوں۔" [1] لیکن عجیب بات ہے کہ حضرت صدیقِ اکبرؓ کی اس وضاحت کے باوجود، اسلامی حکمران تو کجا، عام انسان کو بھی خدا کا خلیفہ

---

[1] "ابوبکر" مصنفہ محمد حسین ہیکل اردو ترجمہ مطبوعہ لاہور۔ صـ ۵۸۳

بنا دیا جاتا ہے۔ اور اس کے لئے قرآنِ مجید کی مندرجہ ذیل آیتِ کریمہ سے استدلال کیا جاتا ہے :-

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۔ ؎۱

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔

یہاں سے خلیفہ سے مراد، اللہ کا خلیفہ مراد لیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہاں نہ تو خلیفۃ اللہ کے لفظ ہیں اور نہ ہی اس بات کا کوئی قرینہ موجود ہے کہ خواہ مخواہ انسان کو اللہ تعالےٰ کا جانشین (خلیفہ) بنا دیا جائے۔ بلکہ اگر عربی لغت کے مفہوم کو سامنے رکھا جائے تو ایسا فرض کر لینا شرکِ جلی نہیں تو شرکِ خفی کی تعریف میں ضرور آتا ہے۔ قرآنی عربی لغت کی مستداول کتاب "مفردات امام راغب اصفہانی" میں اس کے معنی یوں بیان کئے گئے ہیں :-

خلیفہ خلف سے ہے۔ جس کے معنی پیچھے آنے کے ہیں اور خلافت کے معنی دوسرے کی نیابت کرنا ہے۔ یا اس کے قائمقام یا جانشین ہونا، بوجہ اس کی غیر حاضری کے، یا اس کے مرجانے کے، یا کام کی ناقابلیت کے۔

عربی زبان کی ایک اور مستند لغت "تاج العروس" میں لفظ خلیفہ کے یہ معانی بیان کئے گئے ہیں :-

الخلیفۃ۔ دوسرے کا جانشین۔ نیز وہ حکمران جو اپنے سے پہلے حکمران کا جانشین ہو۔ اس کی جمع خلفاء اور خلائف ہے۔

اگر عربی زبان میں اس لفظ کے مادہ کے بنیادی مفہوم کو سامنے رکھا جائے تو اس سے بھی انہی معانی کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ عربی زبان میں خِلْفَةٌ درختوں کے ان پتوں کو کہتے ہیں جو پت جھڑ کے بعد درختوں پر نکلیں۔

ائمہ تفسیر نے بھی لفظ خلیفہ کے یہی معنی بیان کئے ہیں۔ امام بیضاوی لکھتے ہیں :-

والخلیفۃ من یخلف غیرہ وینوب منابہ۔ والمراد بہ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ ؎۲

اور خلیفہ وہ ہے جو کسی دوسرے کا جانشین بنے اور اس کی نیابت کرے۔ اور اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔

امام فخر الدین رازی بھی تقریباً یہی مفہوم بیان کرتے ہیں :-

الخلیفۃ من یخلف غیرہ ویقوم مقامہ۔ ؎۳

خلیفہ وہ ہے۔ جو کسی دوسرے کا جانشین اور قائمقام بنے۔

؎۱ قرآن مجید سورت البقرہ۔ آیت ۳۰۔ ؎۲ تفسیر بیضاوی مطبوعہ مصر جلد اول۔ صـ ۱۳۵۔

؎۳۔ تفسیر کبیر نیا ایڈیشن۔ مطبوعہ مصر۔ جلد دوم۔ صـ ۱۶۵۔

تفسیر کے ایک اور مشہور امام علامہ آلوسی صاحب تفسیر روح المعانی نے تو امام بیضاوی ہی کے الفاظ دھرا دیئے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

والخليفة من يخلف غيره وينوب عنه والمشهور ان المراد به آدم عليه السلام۔ [1]

اور خلیفہ وہ ہے جو کسی دوسرے کا جانشین ہو اور اس کی نیابت کرے۔ اور مشہور یہ ہے کہ اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔

انسان کو خدا کا خلیفہ ثابت کرنے کے لئے مفسرین کی اس تشریح کی یہ تعبیر کی جاتی ہے کہ انسان اس دنیا میں خدا کی نیابت کرتا ہے۔ اول تو "جانشین" کے معانی ہوتے ہوئے اس نظریہ کی گنجائش نہیں۔ دوسرے قرآن مجید کی رو سے ایسا تصور صحیح نہیں۔ نیابت کے معنی ہوتے ہیں۔ کسی کو اپنے اختیارات تفویض کر دینا۔ اللہ تعالےٰ اپنے اختیارات کسی کو بھی تفویض نہیں کرتے۔ نہ کسی بادشاہ کو، نہ مذہبی پیشوا کو، حتیٰ کہ اپنے انبیاء تک کو بھی نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے مطلق اختیارات سے قوانین مرتب کئے ہیں۔ اور اس کے بندے ان قوانین کو پہلے اپنے اوپر نافذ کرتے ہیں۔ اور پھر باقی دنیا پر۔ مختصر یہ کہ اس دنیا میں انسان کا فریضہ قوانین الٰہی کی تنفیذ ہے۔ خدائی اختیار کا کوئی حصہ تفویض نہیں کیا گیا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذکورہ بالا آیت کریمہ میں آدم یا انسان، اللہ تعالےٰ کا خلیفہ نہیں تو پھر وہ کس کا خلیفہ ہے۔ مفسرین نے اس سوال کے واضح جوابات دیئے ہیں۔ جن کی خود قرآن مجید سے بھی تائید ہوتی ہے۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں:۔

والخليفة هنا معناه الخالف لمن كان قبله من الملائكة قيل هو آدم وقيل كل من له خلافة في الارض۔ [2]

یہاں خلیفہ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے سے پہلے کی مخلوق فرشتوں کا جانشین ہے۔ اور کہا گیا کہ یہ آدم علیہ السلام ہیں اور کہا گیا ہے کہ اس سے ہر وہ شخص مراد ہو سکتا ہے جسے زمین میں کسی کی جانشینی حاصل ہو۔

جن معتبر تفسیروں سے میں نے اوپر "خلیفۃ" کے معنی نقل کئے ہیں وہ اس سے ابلیس کی قوم، جن، مراد لیتے ہیں۔ جو آدم یعنی انسان سے پہلے اس کرۂ ارض پر آباد تھی۔ علامہ بیضاوی فرماتے ہیں:۔

وقيل ابليس ومن كان معه في محاربة الجن فانه تعالى اسكنهم في الارض اولا فافسدوا فيها فبعث اليهم ابليس في جند من الملائكة فدمرهم وفرقهم

---

[1] تفسیر روح المعانی۔ مطبوعہ لاہور۔ جلد اوّل۔ صـ۲۲۰

[2] تفسیر فتح القدیر از علامہ شوکانی۔ مطبوعہ مصر۔ جلد اوّل۔ صـ۶۲

فی الجزائر والجبال۔ ؎۱

اور کہا گیا کہ (انسان سے پہلے) کی مخلوق ابلیس اور اس کے وہ ساتھی تھے جو جنوں سے لڑنے کے لئے بھیجے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ان جنوں کو زمین میں آباد کیا لیکن انہوں نے اسے فساد سے بھر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ابلیس کو فرشتوں کے ایک لشکر کے ساتھ بھیجا۔ جنہوں نے انہیں ہلاک کر دیا۔ اور انہیں جزیروں اور پہاڑوں میں بکھیر دیا۔

اس سلسلے میں امام فخرالدین رازی کی تحقیق ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں :-

فقد اختلفوا فی انہ تعالیٰ لم سماہ خلیفۃ۔ وذکروا فیہ وجہین الاوّل۔ بانہٗ تعالیٰ لمّا نفی الجن من الارض واسکن آدم الارض کان آدم علیہ السلام خلیفۃ لاولٰئک الجن الذی تقدموہ۔ یروی ذلک عن ابن عباس۔ ؎۲

اس بارے میں اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو خلیفہ کے لفظ سے کیوں موسوم کیا۔ اس کی دو وجوہات بیان کی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنوں کو زمین سے نکال دیا اور ان کی بجائے آدم علیہ السلام کو زمین میں بسایا تو حضرت آدمؑ ان جنوں کے خلیفہ تھے۔ جو آپ سے پہلے کی مخلوق تھے۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے۔

علامہ آلوسی صاحب تفسیر روح المعانی بھی ایسا ہی کچھ فرماتے ہیں :-

ومعنی کونھم خلفاء انھم یخلفون من قبلھم من الجن او من ابلیس ومن معہ من الملائکۃ المبعوثین لحرب اولئک علی ما نطقت بہ الاثار۔ ؎۳

آدم (انسان) کے خلیفہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے سے پہلے کی مخلوق جنوں کے جانشین بنے، یا ابلیس اور اس کے ساتھ والے ان فرشتوں کے جو ان جنوں سے لڑائی کے لئے بھیجے گئے تھے، کے جانشین بنے، جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے مفسرین نے اگرچہ آدم سے پہلی مخلوق "جن" کے لئے احادیث کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن خود قرآن مجید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ سورت الحجر میں تخلیق آدم کے سلسلے میں ارشاد ربانی ہے :-

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ۔ (۱۵/۲۷)

؎۱ تفسیر بیضاوی۔ مطبوعہ مصر۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۳۵۔

؎۲ تفسیر کبیر نیا ایڈیشن۔ مطبوعہ مصر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۶۵۔

؎۳ تفسیر روح المعانی۔ جلد اوّل۔ مطبوعہ لاہور۔ صفحہ ۲۲۰۔

اور انسان سے پہلے ہم نے جنوں کو نارِ سموم سے پیدا کیا۔

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ جنوں سے کیا مراد ہے۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے بھی آدمؑ (یا انسان) اپنے سے پہلے کسی مخلوق کا جانشین ہے۔ آیت میں مِنْ قَبْلُ کے الفاظ خلیفہ کے معنی کی وضاحت کرتے ہیں۔

علاوہ بریں، قرآن مجید میں اس مادے سے مختلف الفاظ استعمال ہوئے جو انہی معانی کی تائید کرتے ہیں۔ سورۃ الاعراف میں قوم عاد کے متعلق ہے:۔

إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ ۔ [۱]

اور جب تمہیں قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا۔

یہاں یہ معنی قطعاً نہیں ہو سکتے کہ قوم نوح کے بعد تمہیں اللہ تعالےٰ کا خلیفہ بنایا۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہاں خلیفہ واحد کی بجائے اس کی جمع خلفاء استعمال ہوئی ہے۔

پھر اسی سورت میں قوم ثمود کے متعلق ہے کہ انہیں قوم عاد کے بعد ان کا جانشین بنایا۔

إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ ۔ [۲]

جب تمہیں قوم عاد کے بعد ان کا جانشین بنایا۔

اسی طرح دوسری قوموں کے بارے میں قرآن مجید میں یہی ارشاد ہے کہ انہیں پہلی قوموں کا جانشین بنایا گیا ہے۔ سورۃ یونس میں ہے:۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ ۔ [۳]

پھر ہم نے تمہیں ان کے بعد زمین میں جانشین بنایا۔

سورت الاعراف میں جس طرح یہ لفظ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی استعمال ہوا ہے وہ اس کے جانشینی کے مفہوم کو اور بھی واضح کر دیتا ہے۔ جب آپ کوہِ طور پر تشریف لے گئے تو آپ نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا:۔

اُخْلُفْنِي فِي قَوْمِي ۔ [۴]

میری غیر حاضری میں قوم میں میرے جانشین ہو۔

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں ان کی جانشینی کرنا۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اپنی قوم میں عدم موجودگی کا تصور خاص طور پر ذہن نشین کرنے کے قابل ہے۔ اس کے واضح معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص کسی کی موجودگی میں اس کا خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی عدم موجودگی ہی میں ہو سکتا ہے، خواہ وہ زندہ ہو اور اس جگہ موجود نہ ہو، اور خواہ مر چکا ہو۔ یا جیسا کہ امام راغب اصفہانیؒ

---

[۱] سورت الاعراف۔ آیت ۶۹
[۲] سورت الاعراف۔ آیت ۷۴
[۳] سورت یونس۔ آیت ۱۴
[۴] سورت 〃 〃 ۱۴۲

نے لفظ خلیفہ کے معنی میں لکھا ہے کہ وہ متعلقہ مقصد کے نااہل ہو گیا ہو۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی ذات ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے، تو اس کے جانشین کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ سورت الفرقان کی اس آیت سے بھی خلیفہ کے مفہوم جانشینی پر روشنی پڑتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً۔ [1]

اللہ وہ ہے جس نے رات اور دن کو اس طرح بنایا کہ ایک دوسرے کے بعد آتا ہے۔

مختصر یہ کہ خلیفہ کے معنی جانشین کے ہیں اور یہ کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا جانشین نہیں بلکہ وہ اس کا بندہ ہے جو اس کے قانون کے مطابق اس دنیا میں زندگی بسر کرنے آیا ہے۔ اور حضرت آدم (یا انسان) کو جو خلیفۃً فی الارض کہا گیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس دنیا میں اپنے سے پہلے بسنے والی مخلوق کا جانشین ہے۔

عام انسان تو کجا، خود رسول اللہ صلعم نے بھی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ یعنی جانشین یا نائب قرار نہیں دیا۔ اس کا عبد (بندہ) اور رسول ہی کہا۔ آپؐ نے انسانیت تک اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین پہنچایا اور اسے نافذ کیا۔ اپنے اختیارات سے اس میں کوئی اضافہ نہ فرمایا۔ اور جب اس دنیا کی سب سے برگزیدہ ہستی اللہ تعالیٰ کی خلیفہ نہیں تو پھر ایک عام انسان کیسے اللہ تعالیٰ کا جانشین یا نائب بن سکتا ہے!

ان تصریحات سے واضح ہے کہ خلیفۃ اللہ (اللہ کا جانشین) ہونے یا اختیاراتِ خداوندی کا انسان کو تفویض کئے جانا (نیابت) کا تصور یا عقیدہ قرآنِ مجید کے خلاف اور شانِ خداوندی کے منافی ہے۔

طلوع اسلام

اس اہم موضوع کی مزید وضاحت کے لئے پرویز صاحب کی کتاب "ابلیس و آدم" اور "مطالب الفرقان۔ جلد دوم" میں متعلقہ ابواب کا مطالعہ مفید رہے گا۔ نیز "لغات القرآن" میں مادہ (خ۔ل۔ف) کے تحت۔

---

[1] ۔ سورۃ الفرقان ۔ آیت ۶۲ ۔

خریدار متوجہ ہوں جن خریداروں سے ادارہ ہذا کو بیرون لاہور کے بنکوں کے چیک آتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کئی ہفتوں کے بعد وصول ہوتے ہیں جس سے آرڈر متعلقہ کی تعمیل پر بھی اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا گذارش ہے کہ خریداران حتی الوسع ترسیل رقوم بجائے چیک کے منیجر حبیب بنک گلبرگ (مین مارکیٹ برانچ) لاہور کے نام ڈرافٹ بنوا کر آرڈر کے ہمراہ بھیجیں۔ نیز یہ بھی نوٹ فرما لیا جائے کہ ادارہ ہذا کا ٹیلیفون نمبر اب تبدیل ہو کر 880800 ہو گیا ہے۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ لاہور)

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

اسلامی ورثے کی اصلاح واحیاء

(رابطہ العالم الاسلامی مکہ کی ایک تازہ تجویز)

(طلوعِ اسلام شروع سے کہتا چلا آرہا ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے اسلامی لٹریچر ـــ حدیث، فقہ، تفسیر، تاریخ، فلسفہ، کلام میں رطب و یابس کی بڑی آمیزش ہے۔ جب تک اس لٹریچر کی تطہیر نہیں کی جائے گی حقیقی اسلام سامنے نہیں آسکے گا۔ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہماری اس تجویز کو اسلام کے خلاف بہت بڑی سازش قرار دیا گیا اور اسی بنا پر ہمارے خلاف کفر و الحاد کے فتوے صادر کئے گئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ، گالیاں دینے سے حقیقت تو نہیں بدل جایا کرتی۔ وہ اپنے مقام پر اٹل رہتی ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ زمانے کے تقاضے اس تطہیر کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لئے مجبور کر رہے ہیں اور یہ آواز اس گوشے (سعودی عرب) سے اٹھ رہی ہے جو قدامت پرستی میں بڑا متشدد خیال کیا جاتا ہے۔ ہم پروفیسر رفیع اللہ شہاب کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے "رابطہ عالمِ اسلامی" کی اس نہایت مستحسن تجویز سے قارئین طلوعِ اسلام کو روشناس کرانے کی سعی فرمائی۔ طلوعِ اسلام)

رابطہ العالم الاسلامی (مکہ مکرمہ) نے اپنے ہفتہ وار اخبار "اخبار العالم الاسلامی" کے تازہ شمارہ نمبر ۵۸۰ بابت ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء میں تجویز پیش کی ہے کہ مختلف اسلامی علوم۔ مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، ادب اور فلسفہ میں بعض ایسی چیزیں شامل کر دی گئی ہیں جو اسلام کے مزاج کے خلاف ہیں اور ان کی تنقیح یعنی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ یہ تجاویز اخبار کے صفحات پر پورے پانچ کالموں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر ان سب کا ترجمہ کیا جائے تو ایک تو بات لمبی ہو جائے گی اور دوسرے قارئین کی توجہ شاید اصل نقطے سے ہٹ جائے۔ اس لئے ہم ان تجاویز کا جو خلاصہ اخبار کے پانچویں کالم میں پیش کیا گیا ہے اس کا ترجمہ معہ اصل ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اس میں تجویز یہ پیش کی گئی ہے کہ عالمی سطح پر ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو تمام اسلامی ورثے کی اصلاح و احیاء کا اہم کام اپنے ہاتھ میں لے پھر اس ادارے کے

ماتحت مختلف علوم کی تنقیح کے لئے اہلِ علم کی علیحدہ علیحدہ کمیٹیاں ہوں جو مندرجہ ذیل فرائض انجام دیں۔

۱۔ پہلی کمیٹی

کتب تفسیر میں مندرجہ ذیل اصلاح کا کام سرانجام دے۔

فکتب التفسیر تحتاج إلی لجنة تنقیها من الخرافات والاسرائیلیات۔ تلك التی لا تتمشی مع روح الدین۔ "تفسیر کی کتابیں ایک ایسی کمیٹی کی محتاج ہیں جو انہیں خرافات اور اسرائیلیات (جھوٹے یہودی قصوں) سے پاک کر دے۔ کیونکہ یہ دینِ اسلام کی روح کے مطابق نہیں ہیں"۔

۲۔ فقہ کمیٹی

وکتب الفقه تحتاج الی الجنة تنقیها من الافتراضات التی تبعد عن المنقول و المعقول والی جانب ذالك تعمل علی توفیق بین المذاهب الفقهیة جمیعا لرأی الامة الاسلامیة۔ "کتب فقہ کو بھی ایک کمیٹی کی ضرورت ہے جو اسے ایسے تمام فرضی مسائل سے پاک وصاف کر دے جو عقل و نقل دونوں کے خلاف ہیں۔ (نقل سے مراد قرآن و سنت ہے) اور اس کے ساتھ وہ یہ کوشش کرے کہ امتِ مسلمہ کو ایک نقطے پر جمع کرنے کے لئے وہ مختلف فقہی مذاہب میں تعاون کی راہیں تلاش کرے"۔

۳۔ کتب حدیث کمیٹی

وکتب السنة تحتاج الی لجنة تنقیها مما هو منسوب کذبا الی رسول اللہ بدافع خلاف سیاسی او عصبی او بدافع الجهل من ذوی الطبیعة الذین وضعوا احادیث فی فضائل سورة القرآن و فضائل بعض الصحابة۔ "کتبِ احادیث کو ایسی کمیٹی کی ضرورت ہے۔ جو انہیں تمام ایسی جھوٹی احادیث سے پاک کر دے جو مختلف لوگوں نے سیاسی یا کسی دوسری عصبیت کی وجہ سے رسول اللہ صلعم کی جانب دیدہ دانستہ منسوب کر دیں۔ یا جو بعض لوگوں نے نیک نیتی سے قرآن کی سورتوں کی فضیلت اور بعض صحابہؓ کے فضائل کے بارے میں جھوٹی روایات وضع کیں"۔

۴۔ تاریخ کمیٹی

والتاریخ فی حاجة الی الجنة تنقیه مما الصقه به اعداء الاسلام الذین تصدوا لکتابة التاریخ الاسلامی بروح حاقدة۔ "اسلامی تاریخ کو بھی علیحدہ کمیٹی کی ضرورت ہے کہ جو اس سے وہ تمام جھوٹا مواد الگ کر سکے جو اسلام کے دشمن مصنفین نے اسلام سے کینہ پروری کی وجہ سے اس میں شامل کر دیا ہے"۔

اسی طرح اسلامی ادب۔ اسلامی فلسفہ اور علوم طبعی کے لئے علیحدہ علیحدہ کمیٹیوں کے قیام کی سفارش کی گئی ہے جو موجودہ لٹریچر میں سے غیر اسلامی مواد خارج کر دے۔ اور پھر ہر اسلامی علم پر صاف ستھرا لٹریچر تیار کر کے نئی نسل کے ہاتھ میں دیا جائے ـــــ اس کام میں چونکہ مختلف مذہبی حلقوں کی جانب سے مخالفت کا خدشہ ہے۔ اس لئے مقالہ کے آخر میں اس تجویز کی تائید میں یہ ارشادِ نبویؐ پیش کیا گیا ہے۔

لا یحقرن احدکم نفسہٗ۔ قالوا وکیف یحقر نفسہٗ۔ قال یری انّ علیہ مقالاً ثم لا یقول فیہ۔ فیقول اللہ عزوجل یوم القیامۃ مَا منعک ان تقول فی کذا وکذا فیقول خشیۃ الناس۔ فیقول فایّای کنت احقّ ان تخشی۔

تم میں سے کوئی اپنے آپ کو حقیر یعنی گھٹیا نہ بنائے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو کس طرح گھٹیا بنا سکتا ہے۔ حضور صلعم نے فرمایا کہ اس طرح کہ وہ کوئی اچھی بات کہہ سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود چپ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے پوچھیں گے کہ فلاں معاملہ میں تجھے بات کرنے سے کس چیز نے روکا۔ تو وہ کہے گا کہ میں نے لوگوں کے ڈر کی وجہ سے ایسا نہیں کیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائیں گے میں اس بات کا زیادہ حقدار تھا کہ مجھ سے ڈرا جاتا۔

ہمارے ملک میں چونکہ اسلامی نظام کے نفاذ کی کوششیں ہو رہی ہیں اس لئے اگر ان تجاویز کو کہ جو سعودی عرب کے اہم دینی ادارے نے پیش کی ہیں، سامنے رکھا جائے تو بہت سی پیچیدگیاں رفع ہو سکتی ہیں۔

طلوعِ اسلام

جیسا کہ ہم شروع میں کہہ چکے ہیں، یہ تجویز بڑی مناسب اور مستحسن ہے۔ لیکن اس میں ہنوز ایک بنیادی تعلق ہے اور وہ یہ کہ اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ اس عمل تطہیر و تنقیح کا معیار کیا ہوگا۔ یعنی اس کا فیصلہ کس طرح کیا جائیگا کہ ہمارے اس بنیادی لٹریچر میں کون کونسی بات خلافِ اسلام ہے۔ جبتک اس بنیادی سوال کا فیصلہ نہیں کیا جائیگا، عمل تطہیر کی کوئی کوشش مفید نتائج برآمد نہیں کر سکے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ معیار، قرآن اور صرف قرآن ہو سکتا ہے کہ وہی حق و باطل اور غلط اور صحیح کی خدا کی مقرر کی ہوئی کسوٹی ہے۔ اگر اسے معیار مقرر نہ کیا گیا تو پھر متعلقہ کمیٹیوں کے ارکان اپنے اپنے عقائد و مسالک کے مطابق چھان پھٹک کریں گے اور بات وہیں کی وہیں رہے گی۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے اس تجویز کو مستحسن اس لئے قرار دیا ہے کہ اسے تسلیم تو کیا گیا کہ ہمارے اس لٹریچر میں رطب و یابس کی آمیزش ہو چکی ہے اور اس کی تطہیر ضروری ہے، ورنہ اس سے پہلے تو ہمارا قدامت پرست طبقہ اس تصور کو بھی شجرِ ممنوعہ قرار دیتا اور الحاد و بے دینی ٹھہراتا تھا۔ جب (صحیح معیار کے نہ ہونے سے) ان حضرات کا عمل تطہیر مطلوبہ نتائج مرتب نہیں کریگا۔ تو پھر یہ معیار کے متعلق سوچنے پر بھی مجبور ہو جائیں گے۔ انسان اس انداز کے تجرباتی طریق سے بھی حقیقت تک پہنچ جایا کرتا ہے۔ بشرطیکہ نیت نیک، اور ذہن صاف ہو۔ بہرحال ہمیں مجوزہ کمیٹیوں کے تقرر اور ان کے عملِ تطہیر کے نتائج کا شدت سے انتظار رہے گا۔

باب المراسلات

مرکزِ ملّت

قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک صاحب جماعتِ اسلامی سے متعلق ہیں جو حسبِ معمول ہر وقت کوئی نہ کوئی بحث چھیڑے رہتے ہیں اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے ان کا موضوع پرویز صاحب اور طلوعِ اسلام کی مخالفت ہوتا ہے۔ انداز ان کا یہ ہے کہ وہ بکثرت جھوٹے الزامات عائد کرتے ہیں اور لطف یہ کہ جب ان کا جھوٹ ثابت ہو جائے تو انہیں نہ اس پر خفت ہوتی ہے نہ ندامت۔ وہ بلکہ اس جھوٹ پر ایک اور جھوٹ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ اس وقت آپ کے لئے باعثِ زحمت ان کا ایک سنگین سا الزام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پرویز صاحب نے (گورنر جنرل مرحوم) "غلام محمد، جیسے فاسق و فاجر کو (یہ ان کے الفاظ ہیں) "مرکزِ ملت" قرار دے کر، اس کی اطاعت کو بمنزلہ خدا، اور رسول کی اطاعت قرار دیا تھا۔ چونکہ اس کے متعلق ہمیں حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں اور ہم کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس کا ہمیں یقینی طور پر علم نہ ہو، اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس مبینہ واقعہ پر بھی روشنی ڈالیں اور "مرکزِ ملت" کی اصطلاح کے مفہوم کی بھی وضاحت فرما دیں تاکہ بات ہمیشہ کیلئے صاف ہو جائے۔

طلوعِ اسلام

آپ ان حضرات کے جھوٹ پر خفا ہوا کریں نہ متعجب۔ انہیں بتایا یہ گیا ہے کہ زندگی کی بعض اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ ایسا کرنا واجب ہو جاتا ہے (مودودی صاحب) اور یہ تو غالباً آپ کو معلوم ہو گا کہ شریعت کی رو سے، واجب کا ترک کرنا گناہ کا موجب ہوتا ہے۔ اس لئے یہ بیچارے جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جہاں تک "مرکزِ ملت" کی اصطلاح اور اس کے مفہوم کا تعلق ہے، انہیں اس کا اچھی طرح سے علم ہے۔ اس لئے یہ حضرات اگر اس قسم کا الزام تراشتے ہیں تو وہ لاعلمی کی بنا پر نہیں ہوتا۔ وہ دیدہ دانستہ ایسا کرتے ہیں۔ ہم اسے یہاں دہرا دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

طلوعِ اسلام کا پہلا پرچہ مئی ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ آپ اس دور کے پرچوں کے ٹائٹل کی لوحِ جبیں پر مرکزِ ملت اور اس کی اطاعت کے الفاظ نمایاں طور پر منقوش پائیں گے۔ اس کی اکتوبر ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں علامہ اسلم جیراجپوری کا مقالہ "اسلامی نظام" کے عنوان سے اور نومبر ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں پرویز صاحب کا ایک مقالہ "مرکزیت" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان میں انہوں نے بتایا کہ اسلامی نظام، خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا دوسرا نام ہے اور اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی

کی اطاعت اُمّت کا فریضہ۔ اس سنٹرل اتھارٹی کے لئے "مرکزِ ملّت" کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد جولائی ۱۹۴۸ء اور ستمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعتوں میں پرویز صاحب کے مبسوط مقالات شائع ہوئے جن میں اس اصطلاح کے تمام گوشوں پر سیر حاصل بحث کی گئی۔ ان تمام مقالات کو اس کتابچہ میں یکجا کر کے شائع کر دیا گیا جس کا نام ہے "اسلامی نظام"۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ان الفاظ کا صحیح مفہوم سامنے لایا جاتا رہا ہے۔ جب جماعتِ اسلامی نے یہ شوشہ چھوڑا کہ طلوعِ اسلام، ملک غلام محمد (مرحوم) کو مرکزِ ملت قرار دے کر اس کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیتا ہے تو اس کی تردید میں متعدد بار اس کی وضاحت کی گئی۔ ہم اس ضمن میں اس شذرہ کو شائع کرتے ہیں جو جولائی ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا ـــ بالخصوص اس لئے کہ اس میں ملک غلام محمد (مرحوم) کا بھی نام آ گیا تھا۔ وہ شذرہ حسبِ ذیل ہے جو ایک استفسار کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

۱۔ نبی اکرمؐ کی ایک حیثیت یہ تھی کہ حضورؐ خدا کی طرف سے وحی پاتے تھے اور اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے تھے۔ حضورؐ کی یہ حیثیت منفرد تھی جس میں نہ اس وقت کوئی اور شریک ہو سکتا تھا نہ اس کے بعد۔ اس لئے کہ حضورؐ کے بعد خدا سے وحی پانے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ حضورؐ کی یہ حیثیت قیامت تک باقی رہے گی۔ اس لئے کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک وہ حضورؐ کی رسالت پر ایمان نہ لائے۔ رسالت کی حیثیت تو ایسی ہے کہ جب تک کوئی شخص تمام انبیاء پر ایمان نہ لائے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔

۲۔ حضورؐ کا دوسرا منصب ایک ایسا نظام قائم کرنا تھا جس میں خدا کے احکام کو عملاً نافذ کیا جائے۔ اس میں پہلا مرحلہ اس نظام کے لئے تیاری کا تھا۔ اس مرحلہ میں حضورؐ ہی اپنے رفقاء کے سربراہ تھے۔ دوسرا مرحلہ وہ تھا جس میں وہ نظام قائم ہو گیا تھا۔ اس میں حضورؐ اس نظام کے مرکز (بلند ترین اتھارٹی) تھے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح کے مطابق، اس قسم کے نظام کو مملکت یا ریاست (STATE) اور اس اتھارٹی کو (HEAD OF THE STATE) کہا جاتا ہے۔ ان ہر دو مراحل میں حضورؐ کی اطاعت جماعتِ مومنین پر فرض تھی۔

۳۔ حضورؐ کی وفات کے بعد وحی کا سلسلہ تو منقطع ہو گیا لیکن دین کا نظام مسلسل آگے چلا۔ اسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔ اب مرکزِ ملت، حضورؐ کا جانشین، خلیفۃ الرسول یا امیر المومنین تھا، اور اُمت کے لئے اس کی اطاعت فرض تھی۔

۴۔ اگر یہ سلسلہ بدستور آگے چلتا تو ان جانشینانِ رسالت مآب کی اطاعت اسی طرح باقی رہتی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ اور خلافت، سلطنت میں تبدیل ہو گئی جس میں احکامِ خداوندی کے بجائے سلطانی احکام کی فرمانروائی تھی۔ چونکہ دین کا نظام باقی نہیں رہا تھا اس لئے ان سلاطین کی اطاعت اسی قسم کی تھی جس قسم کی دنیا کے اور بادشاہوں کی اطاعت ہوتی ہے۔ ان سلاطین کو "مرکزِ ملت" کہنا ہی غلط ہے۔ "مرکزِ ملت" صرف اسی نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو کہا جائے گا۔ (خواہ وہ ایک فرد ہو یا ایک جماعت) جو احکامِ خداوندی کو نافذ کرے اور امورِ مملکت اُمت کے مشورہ سے طے پائیں۔ جو نظام، خدا کی عائد کردہ حلال و حرام کی قیود کو توڑے اور اوامر و نواہی کی پرواہ نہ کرے وہ طاغوتی نظام ہے۔ اسے خدا اور اس کے رسولؐ سے کیا تعلق؟ اس کی اطاعت، طاغوت کی اطاعت ہے۔ یہ طلوعِ اسلام کے مخالفین کی افترا پردازی ہے جو سب کچھ جانتے بوجھتے محض بدنیتی سے

یہ مشہور کرتے ہیں کہ طلوعِ اسلام (مثلاً) غلام محمد مرحوم یا اسکندر مرزا کو مرکزِ ملت اور ان کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیتا ہے۔ هٰذَا اِفْكٌ عَظِيْمٌ۔ طلوعِ اسلام نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ اس نے مرکزِ ملت کی تشریح ہمیشہ "خلافت علیٰ منہاجِ رسالت" کے الفاظ سے کی ہے۔ یعنی اس قسم کا نظام جو مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کے مقدس ہاتھوں سے قائم ہوا تھا جس میں مملکت کا تمام کاروبار قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہوتا تھا۔

۵۔ جب صحیح اسلامی نظام (یا خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) باقی نہ رہے تو پھر دین عملاً موجود نہیں رہتا، مذہب رہ جاتا ہے جس میں سیاسی امور کو حکومت اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ اور شخصی امور میں لوگوں کو اجازت دیدیتی ہے کہ وہ جس طرح جی چاہے عمل کریں۔ سابقہ اُمتوں میں بھی یہ صورت پیدا ہو جاتی تھی اور اب ہمارے ہاں صدیوں سے یہی ثنویت کارفرما ہے شخصی امور میں لوگ اپنی صوابدید کے مطابق، اس طریق پر چلنے کی کوشش کرتے چلے آرہے ہیں جو حضورؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں رائج تھا۔ اس میں بھی جس قدر اختلاف پائے جاتے ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ اس طریقِ کار میں اختلافات ناگزیر ہیں۔ یہی وہ مجبوری تھی جس کی وجہ سے یہ روایت وضع کر لی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "میری اُمت کا اختلاف رحمت ہے"۔ "مرکزِ ملت" کی موجودگی میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (واضح رہے کہ اب خود اہلِ حدیث حضرات نے بھی اس کا اعتراف کر لیا ہے کہ یہ حدیث وضعی ہے!)۔

۶۔ ایسا نظام، جس میں اُمت کو احکامِ خداوندی کے مطابق چلایا جائے، پھر سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو وہ "مرکزِ ملت" کہا جائے گا جس کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے قائم مقام ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ مرکز سب سے پہلے خود احکامِ خداوندی کی اطاعت کرے گا۔

جو حکومت کسی اصول پر قائم ہو، جب تک وہ مسلسل آگے چلتی رہے اس میں اس کے سابقہ ادوار کے فیصلے علی حالہٖ نافذ العمل رہتے ہیں۔ لیکن جن امور میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو، ان میں اس دور کی حکومت ضروری تبدیلی کر لیتی ہے۔ جب تک اسلامی حکومت (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) قائم رہی، اس میں احکام کی یہی پوزیشن رہی۔ قرآن کریم نے جب امورِ مملکت کو باہمی مشورہ سے طے کرنے کا حکم دیا تھا تو اس کا یہی منشا تھا۔ اس کی روشنی میں جب ہم اس حدیث کو دیکھتے ہیں جس میں نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ "تم پر میری سنت اور میرے خلفائے راشدینؓ کی سنت واجب ہے"۔ تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ یہ "خلفائے راشدینؓ" کسی خاص زمانہ تک محدود نہ تھے۔ اگر خلافتِ راشدہ، مسلسل آگے چلتی تو حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ سے لے کر آج تک کے خلفاء خلفائے راشدینؓ ہوتے۔ اگر وہ سلسلہ کسی وجہ سے منقطع ہو گیا ہے تو اسے پھر جاری کیا جا سکتا ہے، جب وہی سلسلہ پھر قائم ہو جائے گا تو ان نئے خلفائے راشدینؓ کی سنت کی اطاعت واجب ہو جائے گی۔ اس سے مراد ہونگے وہ فیصلے جو یہ نظام قرآن کریم کے احکام کو نافذ کرنے کے سلسلہ میں باہمی مشاورت سے کرے گا۔

یہ ہے اس باب میں طلوعِ اسلام کا مسلک، جسے ہم اپنی بصیرت کے مطابق قرآن کریم سے سمجھ سکے ہیں۔

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ طلوعِ اسلام کے نزدیک "مرکزِ ملت" کا مفہوم کیا ہے؟ لیکن جماعتِ اسلامی والے اس کے بعد بھی یہی رٹ لگاتے جائیں گے کہ پرویز صاحب ملک غلام محمد (مرحوم) جیسے فاسق و فاجر کو مرکزِ ملت قرار دیکر اس کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیتے تھے! سوتے کو تو جگایا جا سکتا ہے، جاگتے کو کون جگا سکتا ہے۔

جبر ہے دِل پہ اختیار کے ساتھ.....!

(قسط دوم - قسط ۱ جون ۱۹۷۸ء میں)

سب سے پہلے انسانی تخلیق کو لیجئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، قرآنی تصریحات کی رُو سے، زندگی، حیوانی منازل میں سے گذر کر، وادیٔ انسانیت میں پہنچتی ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر تخلیقِ انسانی کے سلسلہ میں، قرآن کریم نے پہلے ان منازل کا تذکرہ کیا ہے جن میں حیوان اور انسان مشترک ہیں۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ۔ (۲۳/۱۲) ہم نے انسانی تخلیق کی ابتدا مٹی کے خلاصہ (بے جان مادہ) سے کی۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ۔ پھر ہم نے اسے نطفہ بنایا جو رحم کے اندر ٹھہر گیا۔ اور مادہ کے بیضہ میں قرار گیر ہو گیا۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً۔ پھر اس نطفہ کو علقہ (جونک کی سی شکل میں) تبدیل کیا۔ فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً۔ پھر اس علقہ کو گوشت کا لوتھڑا سا بنا دیا۔ فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ابھار دیا۔ فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا۔ (۲۳/۱۳-۱۴) پھر اس ڈھانچے پر گوشت کی تہ چڑھا دی۔ آپ نے دیکھا کہ تخلیق یا تولید کے یہ وہ منازل ہیں جن میں سے ہر حیوانی جنین گزرتا ہے۔ لیکن اس کے بعد ان دونوں کے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔

سلسلۂ تخلیقِ انسانی

انسان کے متعلق کہا۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ۔ (۲۳/۱۴) اس کے بعد ہم اسے ایک مختلف مخلوق کی ہیئت عطا کر دیتے ہیں۔ اور یہ وہ ہیئت ہے جسے خدا اپنے احسن الخالقین ہونے کی شہادت میں پیش کرتا ہے۔ (۲۳/۱۴) یہاں خدا نے اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا ہے، اور دوسری جگہ اپنے اس تخلیقی شاہکار کے متعلق کہا کہ: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۹۵/۴) ہم نے انسان کو حسین ترین (احسن) ہیئت میں پیدا کیا ہے سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (۱۷/۷۰) ہم نے انسان کو اپنی اکثر مخلوق پر فضیلت عطا کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس سے انسان، سلسلہ حیوانات سے متمیز و ممتاز ہو گیا جس سے اس کی تقویم کو احسن کہا گیا۔ جس سے یہ اس شرف و مجد کا حامل قرار پا گیا! قرآن کریم نے اسے ایک اشارہ میں بیان کیا ہے جب کہا کہ: وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ۔ (۳۲/۹) خدا نے اس میں اپنی توانائی کا ایک شمہ پھونک دیا۔ اس "الوہیاتی توانائی" کی کنہ و ماہیت کے متعلق تو قرآن نے کچھ نہیں بتایا۔ البتہ اس سے انسان، اور دیگر جاندار مخلوق میں جو بنیادی فرق پیدا ہو گیا اس کی صراحت یہ کہہ کر کر دی کہ: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا۔ (۷۶/۳) ہم نے اسے راستہ دکھا دیا اور پھر اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا کہ وہ چاہے تو اُسے اختیار کر لے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ یعنی اس الوہیاتی توانائی کا نتیجہ یہ تھا کہ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ مخلوق بن گیا۔ یہ ہے شرفِ انسانیت، یعنی اس کا صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا۔ قرآن کریم نے انسانی اختیار و ارادہ کے اس محمل کو نفس کہہ کر پکارا ہے۔ ہم اسے انسانی ذات، خودی' (SELF) یا (PERSONALITY) سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسانی نفس (یا ذات) کی دوسری بنیادی خصوصیت اور اہمیت کے متعلق ہم ذرا

آگے چل کر بات کریں گے۔ سرِدست اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ یہ ذات، ہر انسانی بچے کو، بلا امتیاز، خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی ہے۔ اور یہی ہے وہ موہبتِ عظمیٰ جس کی بنا پر کہا گیا ہے کہ: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ۔ (۱۷/۷۰) ہم نے ہر انسانی بچے کو یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ یہی وہ اساسی خصوصیت ہے جس کی بنیاد پر قرآن، مساواتِ انسانیہ کی عمارت استوار کرتا ہے اور یہ ہے وہ سب سے پہلی اور بنیادی حد جسے میں نے انسانی ہیئتِ اجتماعیہ، اس کے نظامِ تہذیب و تمدن اور اس کی معاشرتی، سیاسی، معاشی زندگی کے لئے حدالحدود یا سے تعبیر کیا ہے۔ اس حد کا

علی مفہوم یہ ہے کہ کوئی ایسا آئین، قانون، ضابطہ، مسلک یا نظریہ یا عقیدہ، جس سے ایک انسانی بچے اور دوسرے بچے۔ ایک فرد اور دوسرے فرد میں، کسی اضافی نسبت سے، کسی قسم کی تفریق کی جائے۔ اس حد کی خلاف ورزی ہوگی، اور کوئی ایسا انداز، کوئی ایسی حرکت جس سے کسی انسان کی توہین و تذلیل ہو، اس حد سے تجاوز قرار پائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ معاشرہ میں مختلف مدارج و مراتب ہوں گے۔ لیکن ان کا معیار جوہرِ ذاتی یا پاکیزگیٔ سیرت و کردار ہوگا۔ نہ کوئی اضافی نسبت۔ اختلافِ مدارج کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ: لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ (۴۶/۱۹) درجات کے تعین کا معیار اعمالِ انسانی ہوگا۔ اور اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ (۴۹/۱۳) اور سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہوگا جس کی سیرت سب سے بلند اور پاکیزہ ہوگی۔

اختلافِ مدارج

لیکن اس اختلافِ مدارج کے معنی یہ نہیں کہ جو لوگ مدارج میں نیچے ہوں گے، انہیں بنظرِ حقارت دیکھا جائے گا۔ قطعاً نہیں۔ قرآن نے تکریمِ انسانیت کی بنیاد انسانی ذات کو قرار دیا ہے جو ہر انسان میں یکساں طور پر موجود ہے۔ لہٰذا، کسی انسان کی توہین و تحقیر کے کیا معنی؟ انسان کی توہین تو خدا بھی نہیں کرتا۔ آپ دیکھئے کہ اس عظیم حقیقت کو قرآن نے کس قدر لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ سورہ الفجر میں ہے کہ جب انسان کے حالات نامساعد ہوتے ہیں تو وہ شکایت کرتا ہے۔ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ (۸۹/۱۶) خدا نے مجھے یونہی ذلیل کر دیا۔ اُدھر سے فوراً جواب ملتا ہے کہ یہ غلط ہے کہ خدا نے تمہیں یونہی ذلیل کر دیا — بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ۔ (۸۹/۱۷) تم اس لئے ذلیل ہوئے ہو کہ تم نے معاشرہ ایسا قائم کیا جس میں ذلت اور عزت کے معیار بدل گئے۔ اس میں عزت اس شخص کی ہونے لگی جس کی پارٹی یا جتھہ طاقتور ہو۔ جو شخص معاشرہ میں تنہا رہ جائے، اس کی کوئی عزت نہیں کرتا۔ لہٰذا، تم جو شکایت کر رہے ہو کہ تم ذلیل ہو گئے ہو تو خدا نے ایسا نہیں کیا۔ تمہارے معاشرہ نے خدا کی متعین کردہ حدود کو پامال کر دیا ہے۔ خدا کی متعینہ حد یہ تھی کہ ہر انسان، انسان ہونے کی جہت سے یکساں عزت اور تکریم کا مستحق ہے۔ یہ معیار غیر متبدل تھا، اس لئے اس کی رُو سے ہر انسان کو اس کا اطمینان حاصل تھا کہ خارجی حالات کچھ بھی ہوں، میری وہ عزت جو مجھے انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکے گا۔ لیکن جب عزت و تکریم وابستہ ہو گئی خارجی حالات سے، تو یہ حالات بدلتے رہتے ہیں، اس لئے اس معاشرہ میں آج کا معزز کل کا ذلیل، اور کل کا ذلیل، آج معزز سمجھا جائے گا۔ اس کا ذمہ دار خدا کو نہ ٹھہرائو۔ اپنے

غلط معاشرہ اور اس کے خود ساختہ معیاروں کو قرار دو!

قرآن اس باب میں اس حد تک آگے جاتا ہے کہ وہ مجرم کو اس کے جُرم کی سزا تو دیتا ہے لیکن اس کی تذلیل و تحقیر نہیں کرتا۔ جو عزت اسے بہ حیثیت انسان حاصل تھی، اس سے وہ نہیں چھینتا۔ یہ نکتہ ایک مستقل موضوع ہے اور فرصت کا متقاضی۔ اس مقام پر میں صرف چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔ حضورؐ نبی اکرم نے جن لوگوں (قریش) کے سامنے اپنی اولیں دعوت پیش کی، انہوں نے اس کی مخالفت میں کسی انسانیت سوز جرم سے بھی اجتناب نہ کیا۔ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ان کے

مجرم کو بھی بنظرِ حقارت نہ دیکھو

اِن جرائم کا فطری نتیجہ ان کی تباہی اور بربادی تھا۔ وہ اپنی تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اس پر حضورؐ کا ردِ عمل یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، بہت ٹھیک ہے۔ یہ اس سے بھی بدتر سلوک کے مستحق تھے! لیکن نہیں، حضورؐ کا ردِ عمل ایسا نہیں تھا۔ حضورؐ کی قلبی کیفیت یہ تھی، جس پر خود خدا کو یہ کہنا پڑا کہ: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۲۶/۳) "ایسا نظر آتا ہے کہ تو اس غم میں کہ یہ لوگ صحیح راستہ اختیار کر کے اپنے آپ کو تباہیوں سے کیوں نہیں بچا لیتے، اپنی جان کو گھلا لے گا"۔ ظاہر ہے کہ جس کے ساتھ نفرت ہو۔ جسے انسان ذلیل کرنا اور بے عزت دیکھنا چاہتا ہو، اس کے مصائب پر وہ اپنی جان نہیں گھلاتا! حضورؐ کی اس کیفیتِ قلبی کو قرآن مجید میں دو ایک اور مقامات پر بھی بیان کیا گیا ہے۔ (دیکھئے ۱۸/۶ ز ۳۵/۸)۔ یہ تو رہا مجرمین کے خلاف قلبِ نبویؐ کا ردِ عمل۔ اس باب میں خود خدا کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ غور طلب اور سبق آموز ہے۔ ایک قوم اپنے جرائم کی پاداش میں خدا کے عذاب کی مورد بنتی ہے۔ عین اس وقت جب اس پر تباہی اور بربادی کا عذاب نازل ہوتا ہے، خدا کی طرف سے بے ساختہ آواز آتی ہے کہ: يَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ (۳۶/۳۰) "او میرے بندو! یہ تم نے اپنے آپ سے کیا کر لیا؟" آپ غور کیجئے کہ جسے قابلِ نفرت سمجھا جائے، اس کی تباہی پر ایسا جانگداز اور جگر سوز ردِ عمل کبھی نہیں ہوتا۔ اور آگے بڑھیئے۔ اللہ تعالےٰ کا رسول اللہ سے ارشاد ہے کہ: قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ۔ (۳۹/۵۳) "یہ لوگ جو اپنی خطا کاریوں کی وجہ سے مستوجبِ سزا ہو رہے ہیں، ان سے کہہ دو کہ خدا، تم سے کہتا ہے کہ اے میرے بندو! تم اس پر بھی میری رحمت سے ناامید نہ ہو"۔ غور کیجئے۔ خدا، مجرمین کو بھی "میرے بندو!" کہہ کر پکارتا ہے اور انہیں تسلی دیتا ہے کہ تم میری رحمت سے مایوس مت ہو۔ تم سے غلطی ہو گئی۔ یہ ٹھیک ہے۔ تم اس غلطی کا نتیجہ بھی بھگتو گے۔ لیکن اس کے باوجود تم شرفِ انسانیت سے عاری نہیں ہو گئے۔ تم ہماری طرف لوٹ آؤ۔ ہم اب پھر تمہیں گلے سے لگا لینے کے لئے تیار ہیں۔ (اقبالؒ کے الفاظ میں)۔

جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

آپ دیکھتے ہیں کہ خدا، مجرمین سے بھی ان کا مقامِ انسانیت نہیں چھینتا۔ انہیں ان کی غلطی کی سزا ملتی ہے

لیکن وہ انسان بدستور رہتے ہیں۔ اور انسان ہونے کی جہت سے وہ جس تکریم کے مستحق تھے، ان کی وہ حیثیت بہرحال قائم و دائم رہتی ہے۔ لہٰذا عام انسان تو ایک طرف کسی مجرم سے بھی نفرت آمیز سلوک، وجہ تذلیلِ انسانیت، فلہذا خدا کی مقرر کردہ حد سے تجاوز ہے۔

اور جب تکریمِ انسانیت کی حد اس قدر وسیع ہے تو پیدائش کے اعتبار سے، انسانی بچوں میں کسی قسم کا تفاوت (خواہ وہ ذات اور برادری کی غیر اسلامی تفریق کی شکل میں ہو اور خواہ امارت اور غربت کی انسانیت سوز امتیاز کی صورت میں) منشائے خداوندی کے یکسر خلاف ہے۔ اور کوئی قانون یا معاشرتی نظام جو اس قسم کے تفاوت کو روا رکھتا ہو، خلافِ نظامِ خداوندی ہے۔

انسان اور انسان کا سنگین ترین تفاوت، حاکم و محکوم کی تفریق کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت، اختیار و ارادہ ہے، اور حاکم و محکوم

حاکم و محکوم کا تفاوت

کی تفریق کا میدان وہ ہے جہاں ایک فرد کا اختیار و ارادہ دوسرے فرد کے اختیار و ارادہ سے ٹکراتا ہے۔ انسانی فکر نے بڑی کوشش کی ہے کہ حاکم و محکوم کی تفریق مٹا دی جائے۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کی اس کوشش کی آخری کڑی جمہوری نظام ہے لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اور جمہوری نظام کے مدعیوں کو خود اعتراف ہے۔ اس نظام سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکا۔ یہ تفریق بدستور باقی ہے۔ فرانسیسی مفکر، رینی گوئنو کے الفاظ میں:-

> اگر لفظِ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ اس میں لوگ اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں، تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی تھی، اور نہ آج کہیں موجود ہے اس میں جو لوگ برسرِ اقتدار آ جاتے ہیں، ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں۔ وہ اپنے حاکم آپ ہیں۔ یعنی حکومت عوام کی ہے۔

(THE CRISES OF MODERN WORLD P.106)

لہٰذا، حاکم و محکوم ایک سطح پر نہ پہلے کبھی آئے تھے، نہ اب آ سکے ہیں۔ برسرِ اقتدار طبقہ نے اپنے آپ کو ہمیشہ بلند و بالا سمجھا اور محکوموں کو بنظرِ حقارت دیکھا ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ، خدا کا پیغام لے کر فرعون کے پاس گئے تو اس نے یہ کہہ کر ان کی بات سننے سے انکار کر دیا کہ: قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ۔ (۲۳/۴۷) یہ ہماری محکوم قوم کے افراد ہیں اس لئے ان کی بات سننے کے قابل کیسے ہو سکتی ہے؟ جو بات تین چار ہزار سال پہلے فرعون نے کہی تھی، اس کی صدائے بازگشت آج بھی ہر ایوانِ حکومت سے برابر سنائی دیتی ہے خواہ اس کے الفاظ کتنے ہی بدلے ہوئے کیوں نہ ہوں۔ یہی وہ احساس تھا جس سے جھلا کر مارکس نے کہا تھا کہ جب تک

دنیا میں حکومت کا ادارہ باقی ہے، انسانی طبقات کی تفریق ختم نہیں ہو سکتی۔ بات تو اس نے ٹھیک سمجھی تھی لیکن نہ وہ بتا سکا نہ اس کے متبعین کہ اس تصور کو عمل میں لانے کی صورت کیا ہو سکتی ہے! یہ صورت آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن نے بتائی تھی۔ اس نے کہا کہ حکومت کے ادارہ کا وجود تو بہرحال باقی رہے گا کیونکہ اس کے بغیر انسانی معاشرہ میں انارکی پھیل جائے گی، لیکن اس میں حاکم اور محکوم کی تفریق باقی نہیں رہے گی۔ اس تفریق کو مٹانے کے لئے اس نے اعلان کیا کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (۳/۷۹) "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے ضابطہ، قوانین، نظامِ حکومت یا نبوت تک بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ"۔ اس نے اس حاکم و محکوم کا تصور ختم کر دیا۔ اس کے بعد سوال پیدا ہوا کہ پھر نظامِ حکومت کی صورت کیا ہو گی۔ اس کے لئے اس نے کہا کہ اس نظام کا فریضہ صرف ان حدود کی پابندی کرانا ہو گا، جو کسی انسان کی نہیں بلکہ) خدا کی متعین کردہ اور غیر متبدل ہیں۔ چنانچہ اس آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ: وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ (۳/۷۹) اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم اس کتاب کی رو سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہو، ربانی بن جاؤ۔ اسی کا نام حکومتِ خداوندی ہے۔ اس مقام پر قرآن ایک ایسا لطیف اور عمیق نکتہ سامنے لاتا ہے کہ جوں جوں نگاہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آجاتا ہے۔ اس نے اس نظامِ حکومت کے مرکزِ اوّل، رسول اللہؐ کی اطاعت کو لازمی قرار دیا ہے۔ اسی سے مطاع اور مطیع، یعنی حاکم و محکوم، غلام اور آقا کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے بتایا ہے کہ رسولؐ کی حیثیت ایک معلّم (استاد) کی تھی۔ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (۶۲/۲) یعنی اس نظام میں، مطاع اور مطیع کا رشتہ، حاکم و محکوم یا غلام اور آقا کا نہیں، بلکہ استاد اور شاگرد کا ہو گا۔ ان ہر دو نوعیتوں کے رشتہ کا فرق،

شاگرد اور استاد کا رشتہ

اس مشکل ترین مسئلہ کو نہایت آسانی سے حل کر دیتا ہے۔ اتھارٹی، حاکم و محکوم اور استاد اور شاگرد، دونوں رشتوں میں ہوتی ہے۔ احکام اور ان کی اطاعت بھی ان دونوں میں ہوتی ہے۔ لیکن دونوں کے مقصد و منتہیٰ میں زمین، آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ حاکم یا آقا کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے غلام، ملازم یا محکوم کا زیادہ سے زیادہ استحصال کرے۔ وہ اُسے اپنے مقاصد کے بروئے کار لانے کا ذریعہ سمجھتا ہے اور اس سے اپنے احکام کی اطاعت اس لئے کراتا ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ حاصل اور وصول کرے۔ محکوم یا غلام ان احکام کی اطاعت مجبوراً کرتا ہے اور ہر وقت اس کوشش میں رہتا ہے کہ اپنے آقا سے جان چھڑا کر بھاگ جائے۔

اس کے برعکس، استاد کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم کا زیادہ سے زیادہ حصہ شاگرد کو دیتا جائے۔ اپنی قابلیت کو زیادہ سے زیادہ شاگرد کے سینے میں انڈیلتا جائے تاکہ وہ زیادہ سے

زیادہ قابل ہو جائے۔ وہ شاگرد کی کامیابی میں اپنی کامیابی اور اس کی ناکامی میں اپنی ناکامی دیکھتا ہے۔ وہ شاگرد سے اپنے احکام و ہدایات کی اطاعت اس لئے کراتا ہے کہ اس طرح اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ کی غایت يُزَكِّيهِمْ بتائی ہے۔ (۶۲/۲) یعنی وہ، تعلیم کتاب و حکمت سے ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کرتا ہے۔ یہ ہے حاکم و محکوم کے تعلق کی مثال، قرآنی نظامِ حکومت میں۔ یعنی شاگرد اور استاد کا تعلق، نہ کہ آقا اور غلام کا رشتہ۔ اتھارٹی کا تصور دونوں میں ہوتا ہے، لیکن اس کی غایت ایک دوسرے سے یکسر مختلف بلکہ متضاد ہوتی ہے۔ اس طرح قرآن، نظامِ حکومت کو باقی رکھتے ہوئے، حاکم و محکوم کی تفریق مٹا دیتا ہے۔ وہ ان دونوں کے تعلق کی نوعیت بدل دیتا ہے۔ ان دونوں رشتوں کی نوعیت کا یہی وہ فرق ہے جس کے پیشِ نظر (ERICH FROMM) صحیح ڈیماکریسی اور فاشزم کا فرق، ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ:-

ڈیماکریسی اس نظام کا نام ہے جو اس قسم کے اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی حالات پیدا کرے، جن میں ہر فرد کی مضمر صلاحیتیں مکمل طور پر نشوونما حاصل کر سکیں۔ اس کے برعکس، فاشزم کا نظام اسے کہیں گے (خواہ اس کا نام کچھ بھی کیوں نہ رکھ لیا جائے) جس میں فرد کو خارجی مقاصد کے حصول کا آلۂ کار بنا دیا جائے اور اس کی انفرادیت کی نشوونما کمزور سے کمزور تر ہوتی جائے۔ (ESCAPE FROM FREEDOM)

وہ دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ:-

ایسی سیاسی آزادی جس میں انسان کو سطحِ انسانیت سے گرا دیا جائے۔ جس میں اسے (DE - HUMANISE) کر دیا جائے۔ آزادی نہیں رہتی، غلامی بن جاتی ہے۔ (THE REVOLUTION OF HOPE P. 91)

یہی وہ، (اقبالؒ کے الفاظ) "انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ" ہے۔ جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ (۹۵/۴-۵) اس میں انسان احسن تقویم کے بلند ترین مقام سے گر کر، اسفل سافلین کی پست ترین سطح پر آجاتا ہے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ (۷/۱۷۶) ہم تو چاہتے تھے کہ یہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے۔ لیکن یہ (اپنے بنائے ہوئے زندان میں محبوس ہو کر) زمین کی پستیوں سے چمٹ جاتا ہے۔ یہ "آسمان کی بلندیاں" اس ماحول میں حاصل ہو سکتی ہیں جس میں کسی فرد کی (عملاً تو ایک طرف) اشارۃً اور کنایۃً بھی کسی قسم کی تحقیر و تذلیل نہ ہو۔ کوئی اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلہ میں پست اور حقیر محسوس نہ کرے، اور جس طرف جائے۔ آدمیت احترامِ آدمی کی جنت کشا، نسیمِ حریت افروز اس کا استقبال کرے۔ یہ صرف اس ماحول میں ممکن ہے، جس میں کیفیت یہ ہو کہ:-

کس دریں جا سائل و محروم نیست عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

حاکم و محکوم کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ، حاکم وہ ہوتا ہے جسے قانون سازی کا اختیار ہو۔ قرآن کریم نے یہ تفریق اس طرح مٹا دی کہ قانون سازی کا اختیار کسی انسان کو دیا ہی نہیں۔ اس نے کہا کہ قوانین (یعنی حدود اللہ) خدا کی مقرر کردہ، اس کی کتاب کے اندر محفوظ اور غیر متبدل ہیں۔ نظامِ مملکت کا فریضہ ان حدود کا تحفظ اور افراد کو (جن میں اربابِ نظم و نسق سب سے پہلے شامل ہوتے ہیں) ان کے اندر زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا ہوتا ہے۔ اس لئے اس نظام میں نہ کوئی حاکم ہوتا ہے نہ محکوم

تیری درگاہ میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔

اقبالؒ نے کہا ہے —— کس دریں جا سائل و محروم نیست —— سائل و محروم کے ذکر سے وہ چٹان سامنے آ گئی جس سے ٹکرا کر، احترامِ آدمیت کی کشتی پاش پاش ہو جاتی ہے۔ یعنی روٹی کا مسئلہ۔

روٹی کا مسئلہ

اس میدان میں اگر حدود اللہ کو مٹا دیا جائے، تو اس سے جس قسم کی تذلیلِ انسانیت ظہور میں آتی ہے اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ یہ بھوک ہے جس سے اس قدر مہیب و عظیم قوتوں کے مالک، شیر کو، سرکس کا رنگ ماسٹر، بندر کی طرح نچاتا ہے۔ وہ تو اسے نچاتا ہی ہے لیکن انسانوں کا بالادست طبقہ، حدود اللہ سے سرکشی برت کر، رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے کر، جو کچھ زیر دست محتاج انسانوں سے کراتا ہے۔ وہ کسی حیوان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ اس میدان میں بھی قرآن کریم، احترامِ آدمیت کے تحفظ کے لئے وہی حدبندی کرتا ہے جو اس نے حاکم و محکوم کی تفریق مٹانے کے سلسلہ میں کی تھی۔ یعنی اس نے جس طرح انسانوں کے ہاتھ سے حقِ حکومت چھین کر، اسے خدا کے ہاتھ میں دے دیا، اسی طرح اس نے رزق کے سرچشموں کو بھی یہ کہہ کر انسانوں کے حیطۂ اقتدار سے چھین لیا کہ:۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۲)

تمہیں اور تمہاری اولاد کو رزق ہماری طرف سے ملے گا۔

اس ایک حدبندی نے اس سب سے بڑے حربہ کو مسدود ہی نہیں، معدوم کر دیا، جس سے بالادست انسان، زیردستوں کو محتاج و محکوم بناتے اور ذلیل و خوار کرتے تھے۔ فرعون کی فرعونیت اس دعویٰ پر تھی کہ، أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (۷۹/۲۴) ہم تمہارے "اَن داتا" ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ کہ.... أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي (۴۳/۵۱) اس ملک میں اقتدار میرا ہے۔ اس کی زمین میری ملکیت ہے۔ اس میں بہنے والی نہریں میرے قبضے میں ہیں۔ رزق کے ان سرچشموں پر میرا کلی اختیار و اقتدار ہے، اس لئے تم سب میرے محتاج اور محکوم ہو۔ فرعون، کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں۔ اقتدار و اختیار جب بھی انسانوں کے ہاتھ میں آئے گا، وہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے لیں گے اور اس طرح ان میں سے ہر ایک فرعون بن جائے گا۔ یہی قرآن کے معاشی نظام کے متعلق

اس قدر کثرت اور شرح و بسط سے لکھ چکا ہوں کہ اس مقام پر اس کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں سمجھتا۔ بنیاد اس سارے (قرآنی) نظام کی، یا یوں کہئے کہ مقصود و منتہیٰ اس نظام کا یہ ہے کہ رزق کی احتیاج سے کسی انسان کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ نظامِ حکومت کا فریضہ، خدا کے عطا کردہ رزق کی اس طرح تقسیم ہو کہ کسی فرد کی ضرورت رکنے نہ پائے۔ اور اس کے حصولِ رزق کا یہ حق کسی شرط سے مشروط نہ ہو، بلکہ رزق کی تقسیم کرنے والے ان سے برملا کہیں کہ: لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ (۷۶/۹) اس کا تم سے معاوضہ یا بدلہ لینا تو ایک طرف، ہم اس کے لئے تمہاری طرف سے کسی شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔ بدلہ یا شکریہ کا سوال اس صورت میں پیدا ہو جب ہم نے تمہیں اپنی طرف سے کچھ دیا ہو۔ یہ رزق، تمہارے رازق کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ ہم تو اس کے صرف قاسم (تقسیم کرنے والے) ہیں۔ اسی طرح، جیسے پوسٹ مین، منی آرڈر کا روپیہ تقسیم کر دیتا ہے۔

لیکن قرآن کریم عطائے رزق کے سلسلہ میں جو علم یا غایت بتاتا ہے، اس کی وضاحت کے لئے تقسیم کی یہ تشبیہ بھی ناقص رہ جاتی ہے۔ جس طرح اس نے نظامِ حکومت کے ضمن میں، حاکم و محکوم کا رشتہ، استاد اور شاگرد کا سا بتایا تھا اسی طرح وہ نظامِ رزق میں بھی رازق و مرزوق کا ایسا رشتہ بتاتا ہے جس میں صلہ اور شکریہ کا احساس تک پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس نے اسبابِ رزق (بارش وغیرہ) کو خدا کی رحمت کہہ کر پکارا ہے۔ (۷/۵۷ - وغیرہ) اور ربوبیتِ عالمینی کو اس کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت کی مظہر۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ کے بعد اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۱/۲) کے الفاظ، اسی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ رحمۃ یا رحمٰن و رحیم کا مادہ (ر-ح-م) ہے۔ جس کے اولین معانی رحمِ مادر کے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، رزق دینے والے اور رزق لینے والے کا باہمی رشتہ ماں اور بچے کا ہے۔

ماں اور بچے کا رشتہ

آپ غور کیجئے کہ اس رشتہ سے مفہوم و مقصود کیا ہے۔ ماں اپنے رحم میں، جنین کی پرورش اپنے خونِ جگر سے کرتی ہے اور اس سے اس کے دل میں کسی معاوضہ یا شکریہ کا احساس تک نہیں پیدا ہوتا۔ اس کی انتہائی خواہش، کوشش اور خوشی اس میں ہوتی ہے کہ جنین، رحم میں پرورش پا کر، تندرست و توانا بچے کی صورت میں دنیا میں آئے۔ بالفاظِ دیگر، وہ اپنے بدن کا ایک حصہ تحلیل کرتی ہے تاکہ دوسرے (جنین) کا جداگانہ تشخص قائم ہو جائے۔ یہ رحمت کی رو سے نشو و نما کی منفرد خصوصیت ہے، ورنہ عام روش یہی ہے کہ اگر کوئی کسی کی پرورش کرتا ہے تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کا تشخص ابھرنے نہ پائے۔ اقبالؒ نے پرورش کے ان ہر دو طریق کے بنیادی فرق کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ: ؎

این خدا، نانے دہد، جانے بَرد آں خدا، نانے دہد، جانے دہد

رحمِ مادر میں جنین کی پرورش اس انداز سے ہوتی ہے۔ پیدائش کے بعد وہ بچے کی پرورش پھر اپنے خونِ جگر

سے کرتی ہے اور اس میں بھی اس کی انتہائی خواہش اور کوشش یہی ہوتی ہے کہ بچہ کی صلاحیتیں اس طرح نشوونما پا جائیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جب بچہ پہلے پہل دو قدم چلنے کے قابل ہوتا ہے تو ماں کا دل کس طرح خوشی سے بلیوں اچھلنے لگتا ہے اور وہ کس طرح انتہائی فخر و مسرت سے دوسروں سے کہتی ہے کہ دیکھو! میرا بچہ چلنے لگ گیا ہے۔ بچوں کی سالگرہ کی تقریبیں، ماں کے اسی جذبۂ فخر و مسرت کی مظہر ہوتی ہیں، حالانکہ غور سے دیکھئے تو بچہ جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے۔ ماں کی احتیاج سے آزاد ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اسی میں تو ماں کی محبت کا راز پنہاں ہے۔ وہ اپنے بچے کو محتاج نہیں، آزاد دیکھنا چاہتی ہے۔ خدائے رحمٰن و رحیم بھی ربوبیتِ عالمین سے یہی چاہتا ہے کہ انسان، محتاج نہ رہے، زیادہ سے زیادہ آزاد ہوتا جائے۔ یہ وجہ ہے جو اس نے، اس پرورش کے سلسلہ میں اپنا اور انسانوں کا رشتہ، رحمانیت ——— کا بتایا ہے۔

باپ اور بیٹے کا نہیں بتایا کہ اس رشتے سے وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ ہے رشتہ افرادِ معاشرہ اور اس نظام کا، جس کے ہاتھوں رزق کی تقسیم ہوتی ہے۔ یعنی ماں اور بچے کا رشتہ۔ جس طرح ماں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلا کر نہ اسے محتاج سمجھتی ہے نہ ذلیل۔ نہ بچے سے اس کا معاوضہ طلب کرتی ہے نہ صلہ۔ نہ اس کے لئے اُسے ستائش کی تمنا ہوتی ہے نہ شکریہ کی آرزو۔ اسی طرح حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے رزق تقسیم کرنے والوں کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ وہ آخر العمر تک بھی نہ ان سے معاوضہ طلب کرتے ہیں، نہ اپنی اطاعت کراتے۔

اس کے برعکس، اس معاشی نظام میں جس میں اقتدار انسانوں کے ہاتھ میں ہو، اربابِ اقتدار اور عوام کا رشتہ، قصاب اور اس کے بکرے، یا تانگے والے اور اس کے گھوڑے کا سا ہوتا ہے۔ اور اگر آپ اس میں "ثواب" کا پہلو بھی دیکھنا چاہیں، تو اس رشتے کو ایسا سمجھئے جیسا اس دُنبے اور اس کے مالک کا رشتہ جسے وہ قربانی دینے کے لئے پال رہا ہو۔ اس میں بکرے، گھوڑے یا دُنبے کی پرورش، ان جانوروں کی خاطر نہیں ہوتی۔ اس لئے ہوتی ہے کہ اس سے وہ جانور، ان کے مالکوں کے مقاصد بروئے کار لانے کے قابل رہیں۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہر انسانی ذات، اپنا مقصدِ آپ ہوتی ہے۔ جب کوئی ذات، کسی دوسری ذات کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بن جائے، وہ ذلیل و خوار ہو جاتی ہے۔

ھ یہ جو ہم معاشرہ میں، ماں اور جوان اولاد میں کش مکش دیکھتے ہیں، آپ کو معلوم ہے اس کی نفسیاتی وجہ کیا ہے؟ ماں اپنے بچے کی پرورش کرتی ہے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر چلنے کے قابل ہو جائے، لیکن جب وہ بڑا ہو کر اپنے پاؤں پر چلنا چاہتا ہے تو ماں (یا والدین) اسے اس طرح نہیں چلنے دینا چاہتی۔ وہ اسے اپنی مرضی کے تابع دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کی یہ روش، اس کی سابقہ روش کے خلاف ہوتی ہے اس لئے بچے میں بھی محبت کا وہ جذبہ نہیں رہتا۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ قرآن کریم نے جو یہ نہیں کہا کہ اولاد پر ماں باپ کی اطاعت لازم ہے تو اس میں کس قدر نفسیاتی حکمت مضمر ہے۔

اس میں شرفِ انسانیت باقی نہیں رہتا۔ پندارِ نفس کی اس شکست کا وہ ردِعمل ہوتا ہے جو معاشرہ کے زیردستوں کی طرف سے سرکشی اور بغاوت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ کوئی ذات اپنی ذلت برداشت نہیں کر سکتی۔ معاشرہ تو ایک طرف، جس دن کوئی ماں باپ اپنے جوان بیٹے سے کسی بات پر ناراض ہو کر یہ کہہ دے کہ کیا ہم نے تمہیں اسی دن کے لئے پالا پوسا تھا، اُس کے دل سے اِن کا احترام ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے یہ احساس بڑا اذیت رساں ہوتا ہے کہ میں کسی دوسرے مقاصد کو بروئے کار لانے کا ذریعہ (INSTRUMENT) ہوں۔ میری ذاتی حیثیت کچھ نہیں۔ فرد کی ذاتی حیثیت اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب اس کی ذات کا احترام کیا جائے۔ جب اسے کسی دوسرے کے مقاصد کے بروئے کار لانے کا ذریعہ سمجھ لیا جائے۔ اس کے دل میں نفرت اور سرکشی کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ نظامِ خداوندی، فرد کی اس حیثیت کو مستقلاً قائم رکھتا ہے۔

اور یہاں سے ہمارا رُخ اس گوشے کی طرف مڑ جاتا ہے جسے ہر معاشرہ میں مسلّمہ طور پر اوّلین حیثیت دی جاتی ہے۔ یعنی عدل۔ عدل کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک قانونی عدل اور دوسرا معاشرتی عدل۔ (SOCIAL JUSTICE) قانونی یا عدالتی عدل کے متعلق عام خیال (بلکہ متفق علیہ فیصلہ) یہ ہے کہ اگر کسی متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو جائے تو اسے مبنی برعدل قرار دیا جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن قرآن اس سے آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خود اس قانون کو بھی مطابق عدل ہونا چاہیئے۔ اگر وہ قانون ہی ظلم اور بے انصافی پر مبنی ہو تو اس کے مطابق فیصلے کو مبنی برعدل کیسے کہا جائے گا؟ لہٰذا، وہ سب سے پہلے، قانون کی حد بندی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حدودِ اللہ کی حفاظت کرنے والوں کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ: يَهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ۔ (۷/۱۸۱) وہ الحق، (وحی خداوندی) کے مطابق لوگوں کی راہ نمائی کرتے ہیں، اور اسی کے مطابق عدل کرتے ہیں۔ لہٰذا، قرآن کی رو سے، فیصلہ وہی مبنی برعدل سمجھا جائے گا جو اس قانون کی رو سے کیا جائے جو الحق کے مطابق ہو۔ جہاں تک عدل کرنے کا تعلق ہے وہ اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ: لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ (۲/۴۸) کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی اس پر اثر نہ ہو۔ نہ کسی کی سفارش قبول کی جائے، نہ ہی جرم کا کوئی بدل لیا جائے۔ غرضیکہ اس باب میں کوئی بھی مجرم کا حمایتی نہ ہو۔ فیصلہ یکسر خارجی اثرات سے بالاتر ہو کر کیا جائے۔

عدل

قانونی عدل کا بنیادی مدار شہادت پر ہوتا ہے۔ اس باب میں قرآن کریم نے ایسی حد بندی کی ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ اس نے کہا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ۔ (۴/۱۳۵) اے ایمان لانے والو! تم دنیا میں انصاف قائم کرنے کا موجب بنو۔ اگر تمہیں کسی متنازعہ فیہ معاملہ میں شہادت دینی ہو تو تم نہ مدعی کی طرف سے شہادت دو، نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ تم

صرف خدا کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ اور سچی سچی بات کہدو۔ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ۔ خواہ وہ بات خود تمہاری اپنی ذات کے خلاف کیوں نہ جائے۔ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ۔ خواہ تمہارے والدین یا دیگر اعزہ و اقارب کے خلاف۔ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا۔ خواہ متعلقہ فریق غریب ہو، یا امیر، اس کا بھی کوئی اثر نہ ہو۔ فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا۔ تم تو خدا کی طرف سے گواہ بن کر گئے ہو۔ اس کا حق بہرحال فریقین کے مقابلہ میں فائق ہے۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا۔ یہ عدل کا معاملہ ہے۔ اس میں تمہارے جذبات کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔ (۴/۱۳۵) گواہی دیتے وقت دوٹوک بات کرو، ذومعنی نہ کرو، نہ ہی شہادت دینے میں اعراض برتو۔ یاد رکھو۔ تم لوگوں سے تو کچھ چھپا سکتے ہو۔ خدا سے کچھ نہیں چھپا سکتے۔

ملزم اور مجرم میں فرق

قرآن کریم کی متعین کردہ حدود کے مطابق، ملزم اور مجرم میں بنیادی فرق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ملزم کو اثباتِ جرم تک بے گناہ سمجھو۔ اس کے متعلق حسنِ ظن سے کام لو۔ (۲۴/۱۲) اور حسنِ ظن کا تقاضا ہے کہ ملزم کے متعلق تمہارا اوّلین ردِعمل (RE-ACTION) یہ ہو کہ: هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ۔ (۲۴/۱۲) وَبُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (۲۴/۱۶)۔ یہ الزام جھوٹا معلوم ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! یہاں ایک لمحہ کے لئے رکیئے اور ان چیزوں کو سنیئے جو دورانِ تفتیش، ملزم پر تشدد سے فضا میں تھرتھری پیدا کر دیتی ہیں۔ جن ملزموں پر یہ تشدد کیا جاتا ہے، ان کی اکثریت بے گناہ ثابت ہو جاتی ہے، اور جن کے خلاف جرم ثابت بھی ہو جاتا ہے انہیں جو سزا ملتی ہے، وہ اکثر و بیشتر اس کرب و اذیت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہوتی۔ جس کا کندۂ قصاب انہیں دورانِ تفتیش بنایا گیا تھا۔ کئی ملزم اس اذیت کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دے کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ کئی پاگل ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر اس عذاب سے بچنے کے لئے ناکردہ جرم کا اقرار کر لیتے ہیں۔ یہ طریق تفتیش انتہائی ظالمانہ ہے جو قرآن کی رو سے سنگین جرم قرار پاتا ہے۔ قرآنی نظام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ جو نظام، ملزم کے متعلق اس قدر حسنِ ظن کی تاکید کرتا ہو، وہ اس کے خلاف ایسے وحشیانہ اقدام کی اجازت کیسے دے سکتا ہے؛ مصیبت یہ ہے کہ اس قسم کا طریقِ تفتیش کسی ایک ملک میں نہیں، دنیا کے (قریب قریب) ہر ملک میں رائج ہے اور اگرچہ آئین اور قانون کی رو سے اس کی ممانعت کی جاتی ہے۔ عملاً اسے ہر جگہ روا رکھا جاتا ہے۔ مہذب ممالک میں اس کے لئے بڑے "مہذب" طریقے وضع اور ایجاد کئے جا رہے ہیں۔ ان کے "مہذب" ہونے سے مراد یہ ہے کہ تشدد کی اذیت تو وحشیانہ طریق سے بھی زیادہ کرب انگیز ہو۔ لیکن اس کا کوئی مشہود ثبوت نہ مل سکے۔ بہرحال، اس قسم کے طریقِ دنیا کے (قریب قریب) تمام ممالک میں رائج ہیں۔ قرآن کریم نے ظلم کو سنگین ترین جرم قرار دیا ہے اور اس کا نتیجہ تباہی بتایا ہے۔ اس سے زیادہ شدید ظلم اور کونسا ہوگا کہ ایک ایسے انسان کو جسے عدالت کی طرف سے مجرم نہیں قرار دیا گیا، اس قسم کی روح فرسا، کرب انگیز عقوبات کا نشانہ بنایا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت ساری دنیا جس جہنم کے عذاب میں گرفتار ہے،

منجملہ دیگر وجوہ، اس کی ایک وجہ یہ ظلم بھی ہے جو بے گناہ انسانوں پر روا رکھا جاتا ہے۔ جہاں تک مجرم کی سزا کا تعلق ہے خدا کی مقرر کردہ حد یہ ہے کہ: جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۴۲/۴۰) سزا مطابق جرم ہونی چاہیئے، جرم سے زیادہ نہیں۔ اور اگر مجرم میں احساسِ ندامت اُبھرے اور اس کی اصلاح کی توقع ہو، تو اسے معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، کہ مجرم ارتکابِ جرم کے بعد بھی انسان ہی رہتا ہے، اس لئے انسان ہونے کی حیثیت سے جو اس کا حق ہے۔ یعنی احترامِ آدمیت ـــــ وہ بدستور باقی رہتا ہے۔ نفرت، جرم سے ہوگی، مجرم سے نہیں۔ نفرت تو ایک طرف، قرآن کا حکم یہ ہے کہ: لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ۔ تم ایک دوسرے کا تمسخر نہ اڑاؤ۔ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ عیب جوئی اور نکتہ چینی نہ کرو۔ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔ ایک دوسرے کے الٹ پلٹ نام نہ رکھو۔ وَاجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ۔ کبھی بدظنی سے کام نہ لو۔ وَلَا تَجَسَّسُوْا۔ دوسروں کے معاملات میں یونہی تجسس نہ کرو۔ وَلَا يَغْتَبْ۔ (۴۹/۱۱-۱۲) کسی کی غیبت نہ کرو۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن افرادِ معاشرہ کے باہمی تعلقات کن بنیادوں پر استوار کرنا چاہتا ہے!

اور اس کے بعد عدل کا دوسرا گوشہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ یعنی معاشرتی عدل سے کیا مفہوم ہے، اس کے متعلق مغربی مفکرین نے بہت کچھ کہا ہے۔ مشیگن یونیورسٹی (امریکہ) کا فلسفہ کا پروفیسر (WILLIAM .K.FRANKENA) اس باب میں لکھتا ہے

معاشرتی عدل

کہ معاشرتی عدل کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا ملخص یہ ہے کہ:-

ایک سوسائٹی کو اس وقت مبنی بر عدل کہا جائے گا جب ہر فرد معاشرہ کو وہ کچھ مل جائے جو اس کا حق ہے۔ (WHAT IS DUE HIM)

اس کے بعد وہ خود ہی کہتا ہے کہ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا فیصلہ کس طرح کیا جائے کہ اس کا حق کیا ہے: یعنی یہ فیصلہ کہ (WHAT IS DUE HIM) اور پھر وہ خود ہی کہتا ہے کہ اس سوال کا اطمینان بخش جواب کہیں سے نہیں مل سکتا۔ (SOCIAL JUSTICE) قرآن اس کا جواب دو لفظوں میں دیتا ہے جب کہتا ہے کہ احترامِ آدمیت، ہر فرد کا بنیادی حق ہے۔

ممتاز مغربی مفکر (EARNEST BARKER) اس باب میں لکھتا ہے کہ عدل کی بنیاد اصولِ اخلاق پر ہے اور تمام اخلاقی اصولوں کا سرچشمہ، فرد کی ذات کی قدر و قیمت ہے۔ اسی بنا پر وہ کہتا ہے کہ:-

وہی معاشرہ عدل کا علمبردار کہلا سکتا ہے جس کا مقصود یہ ہو کہ تمام افرادِ معاشرہ کی ذات کی صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو جائے۔

(PRINCIPLE OF SOCIAL JUSTICE AND POLITICAL THEORY P.123)

میں نے عرض کیا من! شروع میں کہا تھا کہ خدا نے جو حدود مقرر کی ہیں ان کی فہرست طول طویل ہے اور میں ان سے

سردست چند ایک آپ کے سامنے پیش کر سکوں گا۔ جو حدود میں نے پیش کی ہیں، انہی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس معاشرہ میں انسانی تقاضے ان حدود کے اندر رہتے ہوئے پورے کئے جائیں، وہ معاشرہ کس قدر جنت بداماں ہوگا اور اس میں رہنے والے زندگی کی کن خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے بہرہ یاب۔

اس کے بعد ایک اہم سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ یہ حدود، قرآن کریم میں حروف و الفاظ کی شکل میں محفوظ ہیں۔ انہیں عملی پیکر بہرحال ایک نظام کی رُو سے عطا ہوگا۔ اور جب ہم نظام کہتے ہیں تو اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نظام، بہرحال انسانوں ہی کے ہاتھوں متشکل ہوگا اور وہی اسے چلائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ وہ انسان کس قسم کے ہوں گے! قرآن، ان انسانوں کو مومن کہہ کر پکارتا ہے۔ نظری اعتبار سے، مومن، انہیں کہیں گے جو ان حدود کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت یقینِ محکم رکھیں۔ لیکن عملاً یہ وہ لوگ ہوں گے جو ان حدود کی پوری پوری پابندی کریں۔ اسی لئے قرآن نے مومنین کی بنیادی خصوصیت اَلْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ (۹/۱۱۲) بتائی ہے۔ "یعنی حدود اللہ کی محافظت کرنے والے" اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (۹/۱۱۲) "ہر اس بات کو عملاً نافذ کرنے والے جسے قرآن صحیح اور جائز قرار دیتا ہے، اور ان سے روکنے والے، جنہیں وہ ناجائز ٹھہراتا ہے"۔

یہاں ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ مومنین بھی بالآخر انسان ہی ہوتے ہیں اور انسان کو خدا نے اختیار و ارادہ کی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جس کی بنا پر یہ انسان (مومنین) صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کے باوجود ان پابندیوں کو از خود قبول کر لیتے اور پھر انہیں بطیبِ خاطر نباہتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ چیز انسان کا اپنی ذات پر ایمان ہے۔ یہ نکتہ تھوڑی سی وضاحت چاہتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ انسانی اختیار و ارادہ، اس کی ذات کی خصوصیت ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ انسان جو بھی فیصلہ کرتا ہے اس کی ذمہ داری اس کی ذات ہوتی ہے۔ اور جب اس فیصلہ کی ذمہ داری اس کی ذات ہوتی ہے تو اس کے نتائج بھی اسے ہی بھگتنے پڑتے ہیں۔ نتائج بھگتنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اگر انسان حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے اپنے اختیارات کا استعمال کرتا ہے تو اس سے اس کی ذات پر تعمیری اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یعنی وہ اس سے نشوونما پاتی ہے اور اگر وہ ان حدود سے تغافل یا سرکشی برتتا ہے تو اس کی ذات پر اس کے تخریبی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ (۲/۲۸۶) اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں اور یہ وہ بنیاد ہے جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس کے لئے نہ کسی (DETECTIVE) کی ضرورت ہوتی ہے نہ پولیس مین کی۔ نہ کسی عدالت کی احتیاج ہوتی ہے نہ جیل خانے کی۔ انسان کا ہر عمل، وہ جہاں اور جس حالت میں بھی سرزد ہو، اپنا نتیجہ از خود اس کی ذات کو متاثر کرتا رہتا ہے۔ اور چونکہ یہ سب کچھ خدا کے متعین کردہ قانونِ مکافات

قانونِ مکافاتِ عمل

کی رو سے ہوتا ہے اس لئے اسے ان الفاظ میں سمجھایا جاتا ہے کہ انسان اپنے ہر عمل کے لئے خدا کے ہاں جوابدہ ہوتا ہے۔ اور چونکہ انسانی ذات، اس کی طبیعی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی، زندہ رہتی اور آگے چلتی ہے (جسے اُخروی زندگی کہتے ہیں) اس لئے اس جوابدہی کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ قرآن کریم نے اس محاسبہ، مواخذہ اور جواب دہی کے سلسلہ کو مختلف انداز سے بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ وہ سب سے پہلے انسان کی اس غلط نگہی اور خود فریبی کو دُور کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ ارتکابِ جرم کرتا ہے۔ أَيَحْسَبُ أَن لَّمْ يَرَهُ أَحَدٌ (۹۰/۷) یعنی وہ سمجھتا ہے کہ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ جب کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا تو خدا اُسے اس وقت بھی دیکھ رہا ہوتا ہے۔ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۵۷/۴) یہی نہیں کہ خدا اُس وقت دیکھتا ہے جب جرم محسوس شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۴۰/۱۹) وہ دل میں چھپائے ہوئے رازوں اور نگاہ کی خیانتوں سے بھی واقف ہوتا ہے اور اس کا ہر ظاہر و باطن عمل ریکارڈ کر لیا جاتا ہے۔ یہ ریکارڈ کہیں خارج میں نہیں رکھا جاتا۔ وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ (۱۷/۱۳) ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹکا ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے وہ

اعمال نامہ

لپٹا ہوا ہوتا ہے اور ظہورِ نتائج کے وقت اسے کھول دیا جاتا ہے۔ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا۔ اور انسان سے کہا جاتا ہے کہ: اقْرَأْ كِتَابَكَ۔ تو اپنا اعمال نامہ خود آپ پڑھ۔ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا۔ (۱۷/۱۴) اور اپنا حساب بھی آپ ہی کر لے۔ "اس کے لئے تو آپ ہی کافی ہے"۔ یہ ہے وہ اعمال نامہ جسے کھلا دیکھ کر انسان چیخ اٹھے گا۔ (فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ) وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا۔ اور کانپتے، تھرتھراتے ہوئے کہے گا کہ یہ کس قسم کا ریکارڈ ہے جس میں میرا ہر چھوٹا بڑا عمل درج ہے۔ انہی اعمال کا نتیجہ اس کے لئے عذاب بن جائے گا۔ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا (۱۸/۴۹)۔ یاد رکھو! خدا کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ انسان کا اپنا کیا اس کے سامنے آجاتا ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! اس تمام داستان کا نقطۂ آغاز اور حرفِ آخر۔ یعنی انسان کا اپنی ذات پر ایمان۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو قرآن کریم، انسان سے بات شروع کر کے، خدا تک لے جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص انسانی ذات، اور اس کے ماله اور ماعلیہ پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کا خدا پر ایمان کچھ معنی نہیں رکھتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خسِ چمن مشو ۔۔۔ منکرِ او اگر شدی، منکرِ خویشتن مشو

ہم نے اوپر کہا ہے کہ یہ چیز انسان کا ایمان ہے جو اسے حدود اللہ کی پابندی پر آمادہ کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایمان کسے کہتے ہیں اور وہ اس قسم کی پابندی کے لئے انسان کو آمادہ کس طرح کرتا ہے؟

ہمارے ہاں لفظ ایمان کا ترجمہ (FAITH) کیا جاتا ہے۔ اور (FAITH) کے متعلق تصور

یہ ہے کہ یہ کسی بات کو آنکھیں بند کرکے مان لینے کا نام ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے، ایمان کا یہ تصور غلط ہے۔ اس کی رو سے، ایمان کے معنی ہیں کسی حقیقت یا صداقت کو علیٰ وجہ البصیرت، کامل عقل و فکر کی رو سے، دل اور دماغ کے پورے پورے اطمینان کے بعد تسلیم کرنا۔ اس اعتبار سے ایمان کا مفہوم ——— (CONVICTION) ——— ہوگا۔ اس نے مومنین کے متعلق کہا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا۔ (۲۵/۷۳)

مومن وہ ہیں کہ (اور تو اور) جب ان کے سامنے قوانینِ خداوندی بھی پیش کئے جائیں تو وہ انہیں بھی بہرے، اندھے بن کر تسلیم نہیں کر لیتے۔

وہ کامل غور و تدبر کے بعد، ان کے مبنی بر صداقت ہونے پر ایمان لاتے ہیں۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی حقیقت کا عقل و شعور کی رو سے سمجھ لینا اس بات کے لئے کافی ہوتا ہے کہ انسان اس کے مطابق عمل بھی کرے؟ سقراط نے کہا تھا کہ (KNOWLEDGE IS VIRTUE) علم ہی نیکی ہے! لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ علم بہت بڑی متاع ہے لیکن مجرد علم نہ تو کارِ خیر کا محرک ہو سکتا ہے اور نہ ہی شر سے رد کنے کا موجب۔ کتنے اقدامات ایسے ہیں جنہیں ہم اچھی طرح جاننے کے باوجود کہ وہ غلط ہیں، ان کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ کتنے جرائم ایسے ہیں جن کا جانتے بوجھتے ارتکاب کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں کہ اگر انسان کو اس کا علم ہو جائے کہ فلاں چیز اس کے لئے مضرت رساں ہے، وہ اس کا مرتکب نہیں ہوگا۔ غالب نے ایک حقیقت بیان کی تھی جب کہا تھا کہ:۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود، طبیعت ادھر کیوں نہیں آتی؟ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص خودکشی کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے لئے سنکھیا حاصل کرتا ہے۔ وہ سنکھیا کے متعلق اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ مہلک ہے ——— اپنی ہلاکت کے لئے اس کا سنکھیا حاصل کرنا اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ سنکھیا کے مہلک ہونے کا اسے علم ہے۔ اس پر اس کا ایمان ہے۔ اس علم کے باوجود وہ سنکھیا کیوں پھانک لیتا ہے اس لئے کہ وہ موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ جو لوگ زندگی کو موت پر ترجیح دیتے ہیں وہ سنکھیا کبھی نہیں کھائیں گے۔ سو فیصلہ کن امر یہ ہے کہ آپ ترجیح کس بات کو دیتے ہیں۔ رشوت لینے سے آپ کو نہایت آسانی سے دس ہزار روپیہ مل جاتا ہے۔ لیکن اس سے آپ کی ذات کا زیاں ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ ان دونوں میں سے کسے ترجیح دیتے ہیں! مومن وہ ہیں جو دس ہزار روپے کے مقابلہ میں اپنی ذات کی حفاظت کو زیادہ عزیز سمجھتے ہیں اس لئے وہ حدود اللہ کی پابندی کرتے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا کہ ان دونوں میں سے کسے ترجیح دی جائے، ذہنِ انسانی کا کام نہیں۔ اس کا مقام اور ہے جسے قرآن نے قلب یا نفس کہہ کر پکارا ہے۔ لہٰذا، اس کے نزدیک، کسی صداقت کو محض فکری طور پر صحیح تسلیم کرنا ہی کافی نہیں۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس صداقت کی اہمیت آپ کے قلب میں بھی اتر چکی ہو۔ دیکھئے قرآن کریم اس حقیقت کو کیسے واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے جب کہتا ہے۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا۔ یہ اعراب (بدو) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں ———

قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا - ان سے کہو کہ ایسا نہ کہو۔ وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا - سرِدست اتنا ہی کہو کہ ہم نے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ - (۴۹/۱۴) ایمان ابھی تک تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا - ایمان اس وقت ایمان کہلائے گا جب صداقت کو (۱) عقل و شعور کی رو سے تسلیم کیا جائے - اور پھر (۲) وہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائے ۔ یہ دوسری چیز وہ ہے جو ترجیحات کا فیصلہ کرتی ہے - دیکھئے! قرآنِ کریم ایک ہی آیت میں ان ترجیحات کو کیسی وضاحت سے بیان کرتا ہے۔

فرمایا :-

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَ
اَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ
اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ
اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ - وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ - (۹/۲۴)

اے رسول! ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں (یا شوہر) اور دیگر اہلِ خاندان - اور مال و دولت جو تم کماتے ہو - اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو - اور وہ مکانات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو - اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں خدا اور اس کے رسولؐ (نظامِ خداوندی) اور اس کے قیام و بقا کی راہ میں جد و جہد سے زیادہ عزیز ہو گئی تو پھر تم (اپنی اس ترجیح کے نتیجہ کا) انتظار کرو - یاد رکھو! خدا، اس قوم کو سعادت اور کامرانی کی راہ کبھی نہیں دکھاتا - جو صحیح راستے کو چھوڑ کر ادھر اُدھر نکل جائے۔

سو بنیادی حقیقت یہ ہے کہ آپ "زیادہ عزیز" کسے رکھتے ہیں - اور اس کا فیصلہ انسان کا نفس (اس کی ذات) کرتی ہے - اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود   جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

اسی سے حدود اللہ کی پاسداری ہوتی ہے - یعنی انسان کا اپنے اختیارات پر کنٹرول کرنا -

مغرب کے مادی تصورِ حیات نے انسانی ذات سے انکار کر کے، زندگی کو طبیعی حدود تک محدود کر دیا جس سے انسانی اختیارات پر کوئی کنٹرول نہ رہا - اس کا نتیجہ یہ کہ دنیا انسانوں کی بستی نہ رہی، درندوں کا بھٹ بن گئی - حکومت کا سیکولر نظام بھی اسی تصورِ حیات کا نتیجہ ہے جس میں اربابِ اقتدار کو لا محدود مطلق اختیارات کا مالک سمجھا جاتا ہے، خواہ وہ شخصی حکومت ہو یا جمہوری -

سوشلزم اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتی ہے - مغربی جمہوریت، حکومت کے حیطۂ اقتدار کو حدود سے مقید نہیں سمجھتی لیکن اتنا تسلیم کرتی ہے کہ پرائیویٹ زندگی میں اخلاقیات کی پابندی کی جاسکتی ہے۔ سوشلزم ان حدود کا سرے سے انکار ہی کر دیتی ہے - لینن کے یہ الفاظ کسے یاد نہیں کہ :-

ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی تصور کے پیدا کردہ ہوں - ہم علانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصور فریب ہے، دھوکا ہے - یہ تصور

جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق محنت کشوں کی طبقاتی جنگ کے تابع ہے۔ یہی ہمارے ضابطۂ اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق احکامِ خداوندی پر مبنی ہے۔ (ہم اس تصوّر کو ٹھکراتے ہیں) ہم خدا وغیرہ کچھ نہیں جانتے۔ ہم اسے مانتے ہی نہیں۔ اخلاق، انسانی معاشرہ ہی کا نام ہے۔ اس سے ماورا، جو کچھ ہے، فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔

MARX - ENGLES MARXISM P. 461-65)

غور سے دیکھئے تو سوشلزم انسانیت کی دُہری تذلیل کرتی ہے۔ ایک تو اس کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کے لئے مسئلہ صرف روٹی کا ہے۔ اس سے وہ انسان کو خالص حیوانی سطح پر لے آتی ہے۔ اور روٹی کے لئے اس کا نظریہ یہ ہے کہ اس کے حصول کے لئے جو طریقہ بھی ضروری خیال کیا جائے، اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس میں قطعاً کوئی حرج نہیں۔ یعنی وہی میکیاولی نظریہ کہ:-

(MEANS ARE JUSTIFIED BY THE ENDS ACHIEVED)

جو ذریعہ بھی مقصد کے حصول میں ممد و معاون ہو، وہ جائز اور مستحسن ہے۔ اس نظریہ کی رو سے روٹی حاصل کرنے کے لئے ہر طریق جائز قرار پا جائے گا۔

حدود اللہ کا نظریہ اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ وہ مقاصد بھی ان حدود کے تابع متعین کرتا ہے۔ اور ان کے حصول کے ذرائع بھی انہی کے اندر رہتے ہوئے اختیار کرتا ہے۔ جو حکومت اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دے، وہ اسے حکومت ہی تسلیم نہیں کرتا اور کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ اس کی اطاعت مت کرو۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا۔ (۱۸/۲۸)

جو ہمارے قوانین فراموش کر دے اور اپنے جذبات ہی کے پیچھے لگ جائے اور یوں حدود شکن ہو جائے۔ اس کی اطاعت مت کرو۔

اطاعت اسی نظام کی ہے جو اپنے اختیارات کو خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کرے۔ مغرب کے سیکولر نظامِ جمہوریت نے کہا کہ قوم کے نمائندے، مملکت کے لئے ایک آئین مرتب کریں اور حکومت اس آئین کے مطابق کاروبارِ مملکت سرانجام دے، اس کی اطاعت، افرادِ مملکت پر قانوناً واجب ہو۔ اس لئے کہ وہ حکومت آئینی (CONSTITUTIONAL) قرار پاتی ہے۔ اور اس کے وضع کردہ قوانین جائز (VALID) لیکن قرآنِ کریم نے کہا کہ سوال یہ نہیں کہ آئین کس کا مرتب کردہ ہے اور

قوانین کسی کے وضع کردہ۔ جو آئین، مستقل اقدارِ خداوندی کی نگہداشت نہیں کرتا، وہ جائز آئین ہی نہیں۔ اور جب وہ آئین ہی جائز نہیں تو اس کے مطابق قائم شدہ حکومت کس طرح جائز اور حق بجانب قرار پا سکتی ہے۔ لہٰذا، اس قسم کی حکومت کی اطاعت بھی جائز نہیں۔ اطاعت اس حکومت کی جائز بلکہ واجب ہے، جو اقدارِ خداوندی کو عملاً نافذ کرے۔

یہ اطاعت، درحقیقت اس حکومت کی نہیں ہوتی۔ ان قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہوتی ہے جسے یہ حکومت نافذ کرتی ہے۔ (اصل یہ ہے کہ چونکہ ہمارے ہاں "حکومت" کا لفظ عام ہو چکا ہے۔ اس لئے اسے استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ قرآنی تصور کی رو سے "انسانوں کی حکومت" کا نظریہ نہ صرف غلط ہے، بلکہ ایسا سمجھنا شرک ہے۔ حکومت صرف خدا کی ہو سکتی ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (۱۲/۴۰) "حقِ حکومت صرف اللہ کو حاصل ہے۔ کسی اور کو نہیں"۔ اگر نظام کا لفظ عام ہو جائے تو یہ مناسب ہوگا۔

مغرب کے خدا فراموش معاشرہ نے اس تصوّر کو رجعت پسندی اور قدامت پرستی سے تعبیر کیا اور کہا کہ اس قسم کی شرائط، حدود اور قیود، مملکت کے اقتدارِ مطلق کی نفی کرتی ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے ناکام تجربہ کے بعد، خود وہاں کے مفکرین نے بھی محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ جو کچھ قرآن کریم نے کہا تھا، وہی صحیح راہِ عمل ہے۔ چنانچہ (BARKER) کہتا ہے کہ:۔

> مملکت کے ساتھ میری وفاشعاری (LOYALTY) ان اقدار کے تابع ہے جن کے تحفظ کے لئے مملکت کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اگر مملکت ان اقدار کی وفاشعار نہیں رہتی تو انہی اقدار کے تقاضا کی رو سے میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ اپنی وفاداری کو عدمِ وفاداری میں بدل دوں اور اس طرح ایک خوشگوار فرماں پذیری کے بجائے، بادلِ نخواستہ مزاحمت کی روش اختیار کر لوں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ مملکت ایسے معاہدہ کا بنیادی حق رکھتی ہے جس کی رو سے اس کی اطاعت ہم پر بہرحال واجب ہو۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مملکت، عدل کی مظہر اور اسے عمل میں لانے کا ذریعہ ہے۔ ہم پر مملکت کے اربابِ اختیار کے احکامات کی پابندی اس لئے لازم ہوتی ہے کہ مملکت عدل قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر مملکت ایسی نہیں رہتی تو اس کے ساتھ ہماری وفاشعاری اور اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔ (ص ۱۶۵، ۱۹۳)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے:۔

> حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اطاعت کا وجوب، مشروط ہوتا ہے، مطلق نہیں ہوتا۔ یہ اطاعت ہر حالت میں واجب نہیں ہوتی۔ یہ اس وقت تک واجب رہتی ہے جب تک یہ حق کے کسی بلند تقاضے کے ساتھ ٹکرائے نہیں۔ (ص ۲۲۰)

بارکر نے کہا ہے کہ اگر اربابِ اختیار حق کی نگہداشت نہ کریں تو مجھ پر واجب ہو جاتا ہے کہ میں ان کی مزاحمت کروں۔ لیکن جو مملکت، قرآنی حدود کی رُو سے قائم ہو، اس کے اربابِ اختیار ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہونے دیتے جس میں افرادِ مملکت اس قسم کی مزاحمت کے لئے مجبور ہو جائیں۔ وہ زمامِ اقتدار ہاتھ میں لینے کے

ساتھ ہی اعلان کر دیتے ہیں کہ:-

تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں۔ لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔

یہ وہ الفاظ تھے جو رسول اللہؐ کے بعد، مسلمانوں کی پہلی حکومت کے سربراہ، صدیق اکبرؓ نے اپنے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمائے تھے اس سے ظاہر ہے کہ خود اسلامی حکومت کے اربابِ حل وعقد کا کردار کتنا بلند ہوتا ہے۔

باقی رہا مغربی اندازِ جمہوریت کا یہ اصول کہ جو قانون اکثریت کی رائے سے منظور ہو وہ بہرحال، مبنی برحق سمجھا جائے گا۔ فلہٰذا، واجب الاطاعت، تو قرآن کریم اس اصول کو بھی باطل قرار دیتا ہے۔ اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ:-

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۔ (۶/۱۱۷)

اگر تم کسی بات کی اطاعت محض اس لئے اختیار کرو کہ اکثریت اس کے حق میں ہے، تو یاد رکھو یہ روش تمہیں خدا کے راستے سے بہکا دے گی۔

اکثریت محض اکثریت ہونے کی بنا پر، حق پر نہیں ہو سکتی۔ لوگ ظن وقیاس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اور ظن وقیاس، حق و باطل کا معیار قرار نہیں پا سکتے۔ حق و باطل کا معیار، خدا کی کتاب ہے اس لئے اطاعت اس حکومت کی لازم ہوگی جو کتاب اللہ کے مطابق ہو۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ وہی مملکت اسلامی کہلا سکے گی جو حدود اللہ کی حفاظت کے لئے قائم ہو اور وہی حکومت برسرِ حق جو ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے اختیارات کا استعمال کرے۔ یہی وہ حکومت ہے جس کی اطاعت دینی فریضہ قرار پاتی ہے۔ یہ حکومت ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے جو حدود اللہ کی نگہداشت کے لئے حکومت قائم کرتے ہیں اور اپنے اختیارات کو ایک مقدس امانت سمجھ کر، انہیں ان حدود کے اندر استعمال کرتے ہیں۔ وہ پہلے خود ان حدود کی پابندی کرتے ہیں اور پھر دوسروں سے ان کی پابندی کراتے ہیں۔ ان حدود کی نگہداشت ان کی زندگی کا مشن اور مقصودِ حیات بن جاتی ہے۔ یہی ان کا ایمان کہلاتا ہے۔

سب سے پہلے خود رسول اس پر ایمان لاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:-

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ (۲/۲۸۵)

اللہ نے، جو کچھ رسول پر نازل کیا، رسول خود اس پر ایمان لاتا ہے۔[1]

---

[1] یہ اعلان ایک عظیم حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ لیکن اس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ (۲/۲۸۵)

پھر دوسرے لوگ بھی اسی طرح ایمان لاتے ہیں۔

رسول اللہ سے اس کا اعلان بھی کرایا گیا تھا۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے۔

قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ۔ (۴۲/۱۵)

اے رسول! اعلان کر دو کہ میں منزّل من اللہ کتاب پر ایمان لاتا ہوں۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ:۔

اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (۶/۱۶۳) میں سب سے پہلا مسلم ہوں۔

یہ ایمان اس قدر پختہ ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی کشش انہیں اس راستے سے بہکا نہیں سکتی۔ قرآن کریم رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ بیوی بچوں کی محبت کو موجبِ تسکین و راحت اور قرۃ العین (آنکھوں کی ٹھنڈک) قرار دیتا ہے۔ مال و دولت کو زندگی کے قیام کا ذریعہ ٹھہراتا ہے۔ وہ پوری تہدی سے اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی چیزوں کو حرام قرار دے؟ وہ کہتا ہے کہ یہ تمام چیزیں انسان کے لئے باعثِ کشش ہیں اور ان کے حصول کے لئے پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر کسی وقت ان چیزوں میں اور مستقل اقدارِ خداوندی (حدود اللہ) میں تصادم واقع ہو جائے۔ ان میں پڑ جائے، تو مومن حدود اللہ کی حفاظت کرتے ہیں اور دنیا کی بڑی سے بڑی کشش کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ زندگی سے زیادہ پُرکشش کونسی چیز ہو سکتی ہے؟ ایسے تصادم کے وقت "مومن" اقدارِ خداوندی کے تحفظ کی خاطر ہنسی خوشی جان بھی دے دیتا ہے۔ مومن کے نزدیک (بقول اقبالؒ)۔

ہے کبھی جاں، اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

اسلامی مملکت کا قیام ان لوگوں کے ہاتھوں عمل میں آتا ہے جن کے لئے دنیا کی کوئی کشش حدود اللہ سے تجاوز کا موجب نہیں بنتی۔ وہ ان حدود کی پابندی اپنے اوپر خارج سے عائد کردہ تصوّر نہیں کرتے۔ یہ ان کی ذات کی پکار اور دل کا تقاضا ہوتا ہے۔ جس طرح (مثلاً) جب انسان آگ سے بچتا ہے، تو وہ کسی کے (خارج سے وارد کردہ) حکم کی تعمیل نہیں کرتا۔ اپنے اندرونی تقاضا کی رو سے ایسا کرتا ہے۔ اس طرح مومن خود ہی اپنے اختیارات کو پابندِ حدود کر لیتے، اور پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ:۔

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

اور ایسا اسی صورت میں ممکن ہے کہ صحیح (قرآنی) تعلیم و تربیت سے قوم میں اس قسم کا نفسیاتی تغیر پیدا کر دیا جائے۔

حقائق و عبر

۱۔ پاگل عورت سے نکاح

جماعت اہلِ حدیث کے ترجمان ماہنامہ محدث کی اشاعت بابت جمادی الآخر ۱۳۹۸ھ میں حسبِ ذیل فتویٰ شائع ہوا ہے:۔

زید ایک پیدائشی مجنونہ لڑکی سے اس کے والدین کی اجازت سے نکاح کر لیتا ہے۔ نکاح کے بعد بھی لڑکی کی حالت بدستور پہلے جیسی ہے۔ زید امامت کے فرائض بھی سرانجام دے رہا ہے۔

مقتدی معترض ہیں کہ امام کی بیوی مجنونہ ہے اور وہ ایسی حرکات کرتی ہے جو شرم و حیا سے خالی ہیں بلکہ مقتدی متنفر ہیں۔ کیا ان حالات میں زید کا نکاح جائز ہے؟ نیز زید شرعاً امامت پر فائز رہ سکتا ہے؟

مستفتی سید الطاف حسین شاہ

الجواب

جب مجنونہ لڑکی کے والد نے نکاح کر دیا ہے تو نکاح بہرحال ہو گیا۔ گو نیک انسان کو بدکار سے نکاح نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن مجنونہ کو بدکار کہنا ہی بے جا ہے کیونکہ وہ مکلف ہی نہیں ہے۔

رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلٰثَةٍ عَنِ الْمَجْنُوْنِ الْمَغْلُوْبِ عَلٰی عَقْلِهٖ حَتّٰی یَبْرَاَ۔ (الحدیث) احمد، ابوداؤد عن علی عمر

ویسے بھی نکاح سے پہلے یا بعد میں جو زنا سرزد ہو جاتا ہے، اس سے نکاح پر اثر نہیں پڑتا۔

لَا یُحَرِّمُ الْحَرَامُ الْحَلَالَ (ابن ماجہ عن ابن عمر و بیہقی عن عائشہؓ)

بعض ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے بسا اوقات یہ کڑوے گھونٹ برداشت کرنے پڑ جاتے ہیں۔

اس نکاح پر غور فرمایئے۔ لڑکی پاگل ہے اور (جیسا کہ خود فتوے میں کہا گیا ہے) غیر مکلف۔ لیکن چونکہ اس کے والد نے نکاح کر دیا ہے اس لئے وہ نکاح جائز قرار پا گیا۔ (ضمناً) ولی کی اجازت سے نابالغ لڑکی کا نکاح بھی جائز قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ہیں ہماری مروجہ شریعت کے احکام۔ ؎

۲۔ روحانی پرواز

ہمارے صدرِ اول کی تاریخ کیونکہ اس زمانے میں مرتب ہوئی جب ساری فضا پر عجمیت چھا چکی تھی اس لئے اس میں حقائق کم اور افسانے زیادہ ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کیلئے

انہی افسانوں میں عہدِ فاروقی کا ایک افسانہ ہے جسے "عروسِ نیل" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جامعہ رشیدیہ ساہی وال سے شائع ہونے والے ماہنامہ الرشید کی اشاعت بابت جون ۱۹۷۸ء میں اسے "روحانی پرواز" کے عنوان سے اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ ہے اور مصر فتح ہو چکا ہے ایک دن مصر کے گورنر عمرو بن العاص نے دیکھا کہ مصری باشندے ایک جلوس میں شریک ہیں اور جلوس کے آگے ایک نوجوان لڑکی ہے جسے انہوں نے دلہن کی طرح سجا رکھا ہے، گورنر نے جب یہ حال دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا، پوچھا کہ یہ جلوس کیسا ہے؟ حضرت عمرو بن العاص رضؓ کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب ان کو معلوم ہوا کہ اسی طرح ہر سال ایک نوجوان لڑکی آراستہ و پیراستہ کر کے دریائے نیل کی نذر کی جاتی ہے اور ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ لڑکی کی بھینٹ سے دریا خوش ہو کر جوش میں آتا ہے اور زیادہ پانی پھیلاتا ہے اور اس طرح سے زیادہ زمین سیراب ہوتی ہے اور فصلیں ہری بھری رہتی ہیں۔ مصریوں کا خیال تھا کہ اگر اس سال لڑکی نہ ڈبوئی گئی تو دریا خشک ہو جائے گا اور فصلیں برباد ہو جائیں گی۔

مصر کا گورنر یہ سن کر لوگوں کے اس غلط عقیدہ اور انسانی قربانی سے کانپ گیا اور جلوس والوں سے کہا کہ وقتی طور پر اس خیال سے رُک جائیں۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے یہ سارا واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھ بھیجا، تاکہ حکم کے مطابق تعمیل ہو سکے۔

جب حضرت عمر رضؓ کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو آپ نے دریائے نیل کے نام ایک خط لکھا جس کا مطلب یہ تھا:۔

"اے نیل! ہر چیز خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اسی کے حکم کے ماتحت چلتی ہے، اے دریا تو پہلے بھی خدا ہی کے حکم سے چلتا تھا اور اب بھی تجھے خدا تعالیٰ کے حکم سے جاری رہنا چاہیئے، لیکن یاد رکھ، اگر انسانی جان کی قربانی، بھینٹ یا نذر سے چلتا ہے تو عمرؓ تیرے خلاف تلوار اٹھائے گا کیونکہ اسلام میں انسانی قربانی ممنوع ہے۔"

آپ نے ایک دوسرا خط مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص رضؓ کو لکھا اور حکم دیا کہ مصری لوگوں کو اس خیال سے باز رکھا جائے اور ان کا خط دریائے نیل کے نام عین

اسی جگہ ڈالا جائے جہاں ہر سال زندہ لڑکی ڈبوئی جاتی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ جب حضرت عمرؓ کا مکتوب دریائے نیل میں ڈالا گیا تو دریا میں اتنا جوش آیا کہ سارا علاقہ سیراب ہوگیا اور پہلے سے بہت اناج پیدا ہوا اور اس دن سے لے کر آج تک دریائے نیل خشک نہیں ہوا۔

ان حضرات کو اس کا بھی علم نہیں کہ تاریخی تحقیق کی رو سے اس زمانے میں مصر میں اس قسم کی کوئی رسم ہی رائج نہیں تھی۔ لہٰذا یہ واقعہ محض افسانہ ہے۔

اور اس افسانے کو منسوب کیا جاتا ہے اس (حضرت) عمرؓ کی طرف جن کی حقیقت پرستی کا یہ عالم تھا کہ نبی اکرمؐ نے صلح حدیبیہ کے وقت ایک درخت کے نیچے (جسے شجرِ رضوان کہہ کر پکارا جاتا ہے) صحابہ کرامؓ سے بیعت لی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں دیکھا کہ لوگ آتے ہیں اور اس درخت کے نیچے نماز پڑھتے ہیں۔ نظر بظاہر اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی، لیکن فاروقِ اعظمؓ کی دور رس نگاہ نے بھانپ لیا کہ آگے چل کر یہ معصوم سی روش توہم پرستی کا موجب بن جائے گی۔ اس لئے آپ نے اسے کٹوا دیا۔ ذرا سوچئے کہ کیا یہی عمرؓ دریائے نیل کی طرف اس قسم کا خط لکھے گا؟ لیکن ہمارے واعظوں کا مقصد تو زیبِ داستان ہوتا ہے۔ انہیں اس سے کیا غرض کہ ان کے ان نشتروں کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے۔

۳۔ مدیر الاعتصام کی خدمت میں

ہم شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں کہ کتاب و سنت کی رو سے مملکت پاکستان کے لئے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے کیونکہ ہمارے ہاں کوئی ایسی کتاب نہیں جس میں درج شدہ سنت کو تمام فرقے متفقہ طور پر صحیح سنتِ رسول اللہؐ تسلیم کرتے ہوں۔ ہم نے طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۷۸ء کے لمعات میں اسی حقیقت کو دہرایا اور عرض کیا کہ:۔

سب سے مقدم کرنے کا کام یہ ہے کہ سنت کا ایسا مجموعہ مرتب کیا یا کرایا جائے جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کریں۔

مسلکِ اہلِ حدیث کے ترجمان ہفت روزہ الاعتصام نے اپنی اشاعت بابت ۲۴ جمادی الآخر ۱۳۹۸ھ میں ایک مقالہ شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے:۔

منکرینِ حدیث کے دل کا اصل روگ

اور اس میں حسبِ معمول طلوعِ اسلام کے خلاف اپنے انتہائی غم و غصہ کا اظہار کیا۔ ہم محترم مدیر الاعتصام کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ براہِ کرم اس کتاب کی نشاندہی کر دیں جس میں درج شدہ

سنت کو تمام فرقے اور جماعتِ اسلامی متفقہ طور پر صحیح سنتِ رسول اللہ تسلیم کرتے ہوں۔ بات صاف ہو جائے گی۔

اور ہم ابھی سے کہے دیتے ہیں کہ یہ قیامت تک ایسا نہیں کر سکیں گے اور ایسے مطالبہ کے جواب میں ان حضرات کے پاس گالیوں کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ ہماری ساری مصیبتوں کی جڑ یہ ہے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت حقائق کا سامنا کرنے سے گریز کرتی ہے۔ اور اتنا نہیں سمجھتی کہ حقیقت سے چشم پوشی کرنے سے مسائل کبھی حل نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں آج تک اسلامی قوانین کا کوئی ضابطہ مرتب نہیں ہوا۔

۴۔ قسمت پر شاکر رہو

جماعتِ اسلامی کے ترجمان ایشیا کی اشاعت بابت ۲۸ مئی ۱۹۷۸ء میں درسِ حدیث کے زیرِ عنوان ایک حدیث درج کی گئی ہے کہ رسول اللہ نے ایک روز صحابہؓ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ کون ہے جو مجھ سے یہ چند باتیں سیکھ لے، پھر ان پر خود عمل کرے یا آگے ان لوگوں کو سکھائے جو ان پر عمل کریں۔ ان میں ایک بات یہ تھی:۔

اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمہاری قسمت میں لکھ دیا ہے اس پر راضی اور مطمئن ہو جاؤ تو سب سے بڑھ کر غنی ہو جاؤ گے۔

یعنی اگر تم مفلس اور غریب ہو تو سمجھ لو کہ یہ افلاس اور غریبی خدا کی طرف سے ہے اس لئے اس پر مطمئن رہو اور اس کے خلاف حرفِ شکایت زبان پر نہ لاؤ۔ نہ ہی اسے دور کرنے کی کوشش کرو کیونکہ یہ تمہاری اس قسمت کی مخالفت ہوگی جسے خدا نے مقرر کیا ہے۔

ہم اس باب میں صرف اتنا دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اگر افلاس اور غریبی خدا کی طرف سے مقدر ہے تو خدا نے اسے عذاب کیوں قرار دیا ہے۔ (دیکھئے سورۃ النحل آیت ۱۶/۱۱۲) اور اکتسابِ رزق کے لئے اس قدر تاکید کیوں کی ہے اور حضورؐ نے یہ کیوں فرمایا ہے کہ: الفقر سواد الوجه فی الدارین۔ غریبی اور محتاجی دونوں جہانوں میں روسیاہی کا موجب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تقسیمِ رزق کے متعلق اسی قسم کی وضعی روایات ہیں جو کمیونزم کو آوازیں دے دے کر بلاتی ہیں۔

۵۔ سیاسی پارٹیاں

طلوعِ اسلام میں اس حقیقت کو بار بار واشگاف کیا گیا ہے کہ قرآنِ کریم نے اُمت میں مذہبی فرقوں اور

سیاسی پارٹیوں کو (یعنی ہر قسم کے تفرقہ کو) شرک قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے ہاں نہ مذہبی فرقوں کے خلاف کسی نے آواز اٹھائی نہ سیاسی پارٹیوں کو خلافِ اسلام قرار دیا۔ زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اب یہ آواز بلند ہونا شروع ہوئی ہے کہ سیاسی جماعتوں کو معطل یا محدود کر دیا جائے۔ اس کے خلاف سب سے پہلے جماعتِ اسلامی کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوئی ہے۔ چنانچہ اس جماعت کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

ملک میں سیاسی جماعتوں کو معطل کرنے اور محدود کرنے کی تجویز ملک کے ساتھ بے انصافی ہے ..... اگر یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو چند ماہ کے دوران سب کچھ چوپٹ ہو جائے گا۔

(نوائے وقت ۱۱ جون ۱۹۷۸ء)

ہم متعدد بار واضح کر چکے ہیں کہ ان مدعیانِ اقامتِ دین کا اسلام اپنی مصلحتوں کے ماتحت بدلتا رہتا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران جب مودودی صاحب نے ہنوز اپنی جماعت کی بنیاد نہیں رکھی تھی تو ان کا ارشاد تھا کہ:۔

مسلمان قوم تو پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت، الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا یہ دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں۔ بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول ص۵۷)

یہ اس زمانے کا اسلام تھا۔ اس کے دو ہی سال بعد انہوں نے اپنی جماعت کی تشکیل کی اور وہ جماعت آج تک قائم ہے اور اس کا نام جماعت اسلامی ہے۔ اسی جماعت کے متعلق اب میاں طفیل محمد صاحب نے آواز بلند کی ہے کہ اسے نہ چھیڑا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو اسلام کا قصرِ مشیّد منہدم ہو جائے گا۔

۶۔ اسلامی سزائیں

طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۸ء میں لکھا گیا تھا کہ مفتی محمود صاحب نے اپنے خطبۂ جمعہ کے دوران فرمایا:۔

چور کے ہاتھ کاٹ دینے کی سزا ہے جسے اسلامی مملکت میں ضرور نافذ ہونا چاہیئے۔ اس سزا کے خلاف تنقید کرنے والے یہ خیال کرتے ہیں کہ ملک کی موجودہ معاشی حالت اور غربت و افلاس کی موجودگی میں اس قسم کی سزاؤں کی کوئی وجہ جواز نہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ صدرِ اوّل میں جب یہ سزائیں نافذ کی گئی تھیں تو وہاں کے معاشی حالات ہمارے موجودہ معاشی حالات سے کچھ بھی بہتر نہیں تھے۔ (ص۴۱)

اب انہی مفتی صاحب نے فرمایا ہے کہ :-

"چوری اور ڈکیتی جیسے جرائم پر ہاتھ کاٹنے کے سلسلے میں پہلے شرعی قوانین نافذ کئے جائیں اور بعد ازاں چھوٹے بڑے کی تمیز کئے بغیر تمام مجرموں کو سزائیں دی جائیں ..... ایک آدھ مجرم کا ہاتھ کاٹنا اور پھر سمجھنا کہ اسلامی شریعت نافذ ہو گئی ہے بالکل غلط ہے۔ اس کا حقیقت سے تعلق نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سلسلے میں پہلے مستقل طور پر قانون نافذ کیا جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان سزاؤں کے حق میں نہیں ہیں۔ بلکہ قاعدہ و قانون کے نفاذ کے بعد ایسی سزاؤں کا خیر مقدم کریں گے۔

اسی سلسلے میں انہوں نے فرمایا :-

کراچی ڈکیتی کے مجرم کا ہاتھ کاٹنے کا اعلان ہوا ہے جبکہ اسلام میں چوری اور ڈکیتی کی سزائیں مختلف ہیں۔ چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور ڈکیتی کی سزا یہ ہے کہ ہاتھ اور پاؤں دونوں کاٹے جائیں۔ چور کی سزا کو ڈاکے کی سزا پر منطبق کرنا اسلامی شریعت سے عدم واقفیت کی دلیل ہے۔ شرعی حیثیت سے اس کوتاہی کی نشاندہی ضروری ہے۔

نوائے وقت۔ بابت ۱۲ جون ۱۹۷۸ء

۷۔ زکوٰۃ

زکوٰۃ کی وصولی کے متعلق آج کل بڑا چرچا ہو رہا ہے اور حکومت کی طرف سے اس سلسلے میں مختلف تجاویز منظر عام پر آئی ہیں جن میں ایک تجویز یہ بھی ہے کہ بنکوں میں جمع شدہ رقم سے زکوٰۃ کاٹ لی جائے۔ مفتی صاحب نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ :-

شرعی طور پر ایسی زکوٰۃ ادا نہیں ہو گی۔ زکوٰۃ کی حیثیت عبادت کی ہے اور اسے ٹیکس کے طور پر وصول نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ادائیگی کے لئے نیت بھی شرط ہے۔ اس زکوٰۃ کی وصولی کا طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ لوگوں کو زکوٰۃ کی ادائیگی پر قائل کیا جائے۔

(نوائے وقت۔ ۱۲ جون ۱۹۷۸ء)

۸۔ ایک اور قوم

حال ہی میں لاہور سے ایک ہفت روزہ جریدہ شائع ہوا ہے جس کا نام ہے "ندائے شیعہ"۔ اس کے پہلے پرچے (بابت ۲۰ مئی ۱۹۷۸ء) کے اداریہ میں بار بار شیعہ قوم کے الفاظ سامنے آتے ہیں۔ مثلاً :-

"اس چھان پھٹک سے کوئی ایسا گوہر یکدانہ حاصل ہو جائے جو شیعہ قوم کو صحیح معنوں

میں قولی نہیں عملی شیعانِ علی بنا دے۔"

یا

"شیعہ قوم میں اتنی بصیرت ہے کہ وہ سیاسی جماعتوں کے عزائم کو سمجھتی ہے۔" یا

"شیعہ قوم کو اتنا مضبوط بنا دو کہ ہر جماعت اپنی بقا و استحکام کے لئے تمہاری محتاج ہو کر تمہارے دروازے پر آئے۔"

اب تک ہم صوبجاتی بنیادوں پر چار قوموں کے نعرہ کا رونا رو رہے تھے۔ اب مذہب کی بنیاد پر ایک الگ قوم کا وجود سامنے آ رہا ہے۔ دیکھیں کہ مسلمانوں کے باقی فرقے بھی کب اپنے آپ کو قوم کہہ کر پکارتے ہیں۔

۹۔ اسلامی نظام اور شیعہ حضرات

ہفت روزہ ندائے شیعہ کی اسی اشاعت میں جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ جس کا عنوان ہے "اسلامی قوانین کا نفاذ" ——— اس میں صاحبِ مقالہ نے مولانا نورانی کی ایک تقریر کا حسبِ ذیل اقتباس پیش کیا ہے۔

ان کی (یعنی نورانی صاحب کی) جماعت نے متعدد بار اس امر کی وضاحت کی ہے کہ نظامِ مصطفےٰؐ کی اصطلاح سے مراد کیا ہے۔ نظامِ مصطفےٰؐ کا عملی مظاہرہ خود پیغمبرؐ نے کیا تھا۔ جو لوگ آج نظامِ مصطفےٰؐ کے بارے میں سوالات کر رہے ہیں وہ نبی اکرمؐ کی زندگی اور ان کی تعلیمات سے ناآشنا ہیں۔

صاحبِ مقالہ نے مولانا نورانی صاحب کی اس تقریر کو خوش آئند قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہی صورت صحیح ہے کہ "اسلامی دستور علیٰ منہاج النبوۃ" ہو۔ یعنی فقط آنحضرتؐ کی زندگی کو قابلِ تقلید قرار دیا جائے۔ ورنہ اگر بات خلافتِ راشدہ یا عہدِ بنی امیہ اور بنی عباس تک گئی تو اختلافات کے دروازے کھل جائیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے:۔

ہماری حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی جب دوسرے دن خود ان کی (یعنی نورانی صاحب کی) جماعت کے ایک مرکزی رکن جناب پروفیسر شاہ فرید الحق صاحب نے عنوانِ شائستہ سے ان کے بیان کی تردید کر دی اور نظامِ مصطفےٰؐ کی اک نئی تشریح بھی پیش کر دی۔ انہوں نے فرمایا۔ "مسلمان' اس اسلام کو قبول کریں گے جو رسول اللہؐ یا صحابہ کرام رضؓ، اہلبیتؑ۔ اولیائے کرامؒ اور مسلکِ صالحین سے ہم تک پہنچا ہے۔ آپ اسے فرقہ کہئے یا تعصب۔ اگر اکثریت اس پر عمل پیرا ہے تو یہی دینِ اسلام ہے اور دینِ مصطفےٰؐ۔"

حال ہی میں (۱۲ر جون ۱۹۷۸ء) محترم برقؔ ہی صاحب کے حوالے سے یہ خبر منظرِ عام پر آئی ہے کہ محترم چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اسلامی قوانین کے متعلق عنقریب کوئی مفصل اور متعین اعلان فرمائیں گے۔

ہمیں اس اعلان کا بڑی بے تابی سے انتظار ہے۔ اس ضمن میں ہمیں ایک اشتہار موصول ہوا ہے جس میں اعلان کیا گیا ہے کہ سرگودہا میں فقہ جعفریہ کانفرنس منعقد ہوگی۔ (غالباً اس وقت تک اس کانفرنس کا انعقاد عمل میں آچکا ہوگا)۔ اس اشتہار میں کہا گیا ہے۔

پاکستان میں ملتِ اسلامیہ تین مکاتیبِ فکر پر مشتمل ہے۔ حنفی، شیعہ اور اہلِ حدیث۔ شیعہ آئمہ اہلِ بیت اطہار علیہم السلام کو سرکارِ رسالت ؐ کی سنتِ مطہرہ کا منصوص من اللہ مفسر مانتے ہیں۔ جبکہ حنفی امام ابوحنیفہ ؒ کے مقلد ہیں اور اہلِ حدیث غیر مقلد ——— پاکستان میں ان مسلمہ مکاتیبِ فکر نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہی کتاب و سنت پر عمل پیرا رہ کر زندگی بسر کرنا ہے۔ اور کسی ایک مکتبِ فکر کو دوسرے پر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ مذہبی آزادی کا مفہوم ہی ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا جملہ قوانین کی تدوین میں ان اسلامی مکاتیبِ فکر کے مسلمات کو پیشِ نظر رکھا جانا ضروری ہے۔ انہی مقاصد اور حقائق کی وضاحت کے لئے مجوزہ کانفرنس کا انعقاد ہو رہا ہے۔

تین اہم موضوعات کا ایک پمفلٹ

عنوانات:۔ ۱۔ خدا اور قیصر۔ ۲۔ ہماری مسجدیں۔
۳۔ اسلام میں پارٹیوں کی اجازت نہیں۔

ان کی اہمیت کے پیشِ نظر ان مضامین کو شمارہ اپریل و جون ۱۹۷۸ء سے علیحدہ کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ جو ہمیں اور دیگر احباب انہیں حسبِ ضرورت منگوالیں۔ قیمت ایک روپیہ ناظم ادارہ

معراجِ انسانیت

سیرت صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام خود قرآن کے آئینے میں مفکرِ قرآن کا بلند پایہ شاہکار عقل و عشق، فکر و نظر، دل اور دماغ کا حسین امتزاج۔ اس سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے ——— مقامِ محمدی ——— اور ——— انقلابِ محمدی نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

حسنِ معنوی کے ساتھ صوری پاکیزگی بھی دیدہ زیب، بڑی تقطیع، اعلیٰ درجہ کا سفید کاغذ ضخامت پانصد صفحات کتابت طباعت نورانی۔ جلد مضبوط اور دلکش۔ قیمت ۴۵/- روپے (علاوہ محصول ڈاک)

مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور | ملنے کا پتہ | ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور